مراتب اختر

شخصیت و فن

مشتاق عادل

مراتب اختر

شخصیت و فن

مشتاق عادل

مراتب اختر

شخصیت و فن

(تحقیقی و تنقیدی مقالہ)

مشتاق عادل

مہکاں پبلشرز 92 راوی بلاک شادمان ٹاؤن ساہیوال

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں)

Licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

نام کتاب	مراتب اختر شخصیت و فن
نام مصنف	مشتاق احمد امتیاز
قلمی نام	مشتاق عادل
موبائل نمبر	0333-6912920
صفحات	212
تعداد	500
تاریخ اشاعت	جولائی 2014
ٹائیٹل	قمر الزماں
کمپوزنگ	عابد حسین
مطبع	فرید یہ پرنٹنگ پریس لیاقت چوک ساہیوال
قیمت	-/400 روپے

ARI ID: 1688721480270

یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

انتساب

اپنے تمام اساتذہ کے نام جن کی محنت، محبت،
راہنمائی اور حوصلہ افزائی سے میں اس قابل ہوا

فہرست ابواب

۱۔	شیخوشریف کا تاریخی پس منظر	24
۲۔	خاندان مراتب اور ادب	46
۳۔	مراتب اختر کا توقیت نامہ	69
۴۔	مراتب اختر کی شاعری کا پس منظر اور معاصر منظر نامہ	92
۵۔	مراتب اختر کی غزل گوئی	122
۶۔	مراتب اختر کی نظم گوئی	150
۷۔	مراتب اختر معاصرین کی نظر میں	178
۸۔	مراتب اختر کا ادبی مقام و مرتبہ (نامور ادیبوں اور دانشوروں کی نظر میں)	190
۹۔	ماحصل	201

پیش لفظ

میں نے ایم۔فل اردو کا تدریسی دورانیہ مکمل کیا تو مقالہ کے لئے موضوع کے انتخاب کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ میری خواہش تھی کہ میں علاقہ کے کسی شاعر/ادیب پر کام کروں تا کہ مقالہ بھی مکمل ہو جائے اور دھرتی کا کچھ قرض بھی ادا ہو جائے۔ جب میں نے استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر سید اشفاق حسین بخاری سے اس خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے بھی اس تجویز کو پسند فرمایا۔ میں نے کافی سوچ بچار کے بعد مراتب اختر پر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ ان کی کتاب ''گنج گفتار'' میری نظر سے گزر چکی تھی اور میں ان کی شاعری سے کافی متاثر بھی ہوا تھا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ مراتب اختر پر ایم۔فل کی سطح پر کسی نے کام نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر بخاری صاحب نے میری اس تجویز کو پسند فرماتے ہوئے مجھے کام کی اجازت دے دی۔

اس سے پہلے مشتاق عادل کے قلمی نام سے میری چار کتابیں ''ساہیوال دے ہیرے'' ''تاریخ ساہیوال'' ''سورج لبھدا سایہ'' اور ''قلم کا قرض'' چھپ چکی تھیں اور دوسرے دوستوں کی نسبت میں کافی پر اعتماد تھا۔ کام شروع کیا تو احساس ہوا کہ یہ کام مشکل ہے، مگر جب کبھی کہیں رکاوٹ

پیش آئی یا مسئلہ پیدا ہوا تو بخاری صاحب نے ہمیشہ حوصلہ بڑھایا اور راہنمائی فرمائی۔اس مقالہ کی تکمیل پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے بعد سب سے پہلے اور سب سے زیادہ میں اپنے نگران پروفیسر ڈاکٹر سید اشفاق حسین بخاری کا احسان مند ہوں جن کی راہنمائی میسر نہ آتی تو شاید میں اتنا مشکل کام کبھی نہ کر پاتا۔اس کام کی تکمیل میں میری ماں کی دعائیں بھی شامل تھیں اور دوستوں کا تعاون بھی۔ میں بارِ دیگر سپاس گذار ہوں استادِ محترم پروفیسر ڈاکٹر اشفاق حسین بخاری کا جنہوں نے کتاب کا دیباچہ لکھ کر مجھ پر احسان فرمایا۔ میں احسان مند ہوں محترم جناب حفیظ خاں کا جنہوں نے اس کتاب کا فلیپ لکھا اور پروفیسر ڈاکٹر اصغر علی بلوچ ، پروفیسر افتخار شفیع اور پیر سیّد سید علی ثانی گیلانی کا بھی جنہوں نے اس کتاب پر مضمون لکھے۔ میں شکر گزار ہوں عون الحسن غازی کا جنہوں نے مراتب اختر کے حوالے سے کتب فراہم کر کے میرے کام کو آسان کر دیا۔ اللہ یار ثاقب، وقار احسن، شفیق موہل، عتیق الرحمٰن اور رانا محمد اسحاق کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے پروف ریڈنگ میں معاونت کر کے بوجھ کم کیا اور عابد صاحب کا جنہوں نے بجلی کے بحران کے باوجود بروقت کام مکمل کر کے میرے حوالے کیا۔ میں اس کاوش میں کس حد تک کامیاب رہا فیصلہ قارئین کریں گے۔

مشتاق عادل

دیباچہ

شخصی خاکہ نگاری کی ادبی روایت سلف سے آ رہی ہے۔ اس کی سی حرفی بسا اوقات موضوعاتی حدود سے متجاوز ہو کر سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار تک کا احاطہ کرتی ہے تو کبھی شخصیت کے خدوخال کی شیرازہ بندی آزادروی سے کرتے ہوئے ہر وہ صفت اس عنوان کا جزوِ لاینفک بنا ڈالتی ہے کہ جس کا مُدّعا اس کا متقاضی نہ تھا۔ تاہم جزئیات سے قطع نظر، بادی النظر میں چونکہ شخصیت نگاری صنفِ غزل کی طرح تہی داماں نہیں اور ہمہ اقسام کے موضوعات کو اپنے انگ میں سمونے اور جذب و ہزل سے بے نیاز ہے۔ شاید اسی سبب یہ صنف غلو اور سجود و قیود کی قدغن سے بھی مبّرا قرار پائی ہے۔

بعض ہمہ جہت شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن کے پرتوِ اظہار و بیان میں قلم کی موشگافی کو لگام دینا ادبی گستاخی کے مترادف ٹھہرتا ہے۔ ''مراتب اختر'' بیسویں صدی کے نصف النہار کے ما بعد کا سورج ہے کہ جس کی تمازت کی بازگشت حلقۂ احباب سخن میں سنائی دی اور رفتہ رفتہ اس روشنی نے ادبی پرداخت میں الگ سے ایک زاویہ نگاہ بنایا اور پہچان کی بنا ڈالی۔ ''حصار حال''، ''جنگل سے پرے

سورج'' اور'' گنجِ گفتار'' جیسے مجموعہ ہائے غزل سے گزرتے ہوئے نظموں کی وادی میں داخل ہوئے اور پھر اس دشت میں تخیلاتی جولان گاہ کی جوت جگائی اور'' گزرا بن برسے بادل'' جیسی شاہکار تخلیق مرتب کر ڈالی۔

غزل گوئی میں'' مراتب اختر'' نے حمد و نعت سے لے کر سماجی، معاشرتی اور شخصی شکست و ریخت تک کے سبھی عنوانات کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ ان کی قلمی رَو کا کینوس وسیع ہے۔ لفظی پیکر تراشی اور مرصع کاری میں انہیں خصوصی ملکہ حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اَب آدمی کی حِس پر، مسلط مشین ہے
اَب زر کی جستجو ہے، خدا پھر کبھی سہی

گنجینۂ خیال میں بہتے ہوئے ذہنی خلفشار، مسائل اور الجھنوں کے جھمیلوں میں پھنسے اور دھنسے انسان کو ذاتی حصار سے نکلنے کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ وہ اسی شش و پنج کے سے ردو کد میں زیست کے تار و پَو دبُنتا ہے اور اسی ادھیڑ بُن میں بالآخر زندگی کا تانہ بانہ ٹوٹ جاتا ہے اور متحرک زندگی یکسر جمود کی کیفیت سے دوچار رہ کر ساکت ہو جاتی ہے یہی انسانی فطرت اور ازلی صداقت ہے۔ جو اپنے ہونے کا احساس بھی دلاتی ہے اور وجۂ موجود کی طرف اشارہ کناں رہتی ہے۔

میرا وجود رونقِ صد حجلۂ دوام
اے دوست بے ثباتی دنیا نہیں ہوں میں

انہوں نے اپنے شعور و وجدان کی اتھاہ گہرائیوں سے آبدار موتی چُنے ہیں، کہ جن کی چمک مدتوں ماند نہیں پڑے گی۔ وہ اعلیٰ تخلیقی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شاعری میں فنی ریاضت کے ساتھ ساتھ عہد آفرینی اور ماحول کی عکاسی کے تراشیدہ نگینے جا بجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ شاعری تو گویا اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ نظم و غزل دونوں اصناف پر ان کی گرفت یکساں مضبوط ہے۔ ان کے ہاں صوفیانہ و

عاشقانہ واردات کی چاشنی سحر انگیز ہے۔ان کی شاعرانہ عظمت کے تسلسل میں ذیل کے شعر پر اکتفا کرتا ہوں۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

''مراتب اختر'' ۲۵ دسمبر ۱۹۸۸ء کو اس دارِفانی سے کوچ کر گئے مگر شاعری کے مہ وانجمیں کا انمٹ خزانہ پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ان کی شاعری میں بے ساختگی، اشعار میں ژولیدگی کی جگہ بالیدگی، اسلوبِ ادا، بانکپن اور وارفتگی اور رچاؤ کا استحسان ابھی تک کسی شیرینی کے ذائقہ کی باقیات کی طرح طبیعت میں حلول ہے۔حیات وممات کا لامتناعی سلسلہ نہ جانے کب تک قائم ودائم رہے مگر یہ حرفِ مکرر ہے کہ ایسی ہستیوں کا ورود خال خال ہی ہوا ہے۔

زیرِنظر کتاب دراصل ''مشتاق احمد امتیاز'' (قلمی نام مشتاق عادل'' کا ایم فل اردو کا مقالہ ہے، جو اس نے میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ایسے ہونہار طالبِ علم کی کتاب کا دیباچہ لکھنا میں نے کسی سعادت سے کم نہیں سمجھا۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ موصوف نے موضوع اور شخصیت، ہر دو سے مکمل انصاف کیا ہے۔''مراتب اختر'' کے حفظِ مراتب کا بخوبی احساس کرتے ہوئے شخصیت کے خدو خال کے نہاں گوشوں کو اجاگر کرنے میں مشتاق عادل نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔مشتاق عادل کہتے ہیں:۔

> ''میں اپنے ممدوح 'مراتب اختر' کو اس طرح یاد کرتا ہوں جیسے کوئی دیارِ غیر میں بستے ہوئے کسی عزیز کو یاد کرتا ہے، جیسے کوئی محروم تخت شہنشاہ اپنے جاہ وجلال کو یاد کرتا ہے۔جیسے کوئی اسیر آزادی وسکون کو یاد کرتا ہے اور جیسے کوئی بھٹکا ہوا پنچھی اپنے مسکن کو یاد کرتا ہے۔''

جب میں اس مقالے کے فنی محاسن کی جانچ پڑتال اور قطع و برید میں مصروف تھا، مجھے اس وقت بھی اندازہ تھا کہ مشتاق عادل نے بڑی دانش وعلمی فراست کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے مقالے کے حسن قبح میں سوانگ کے جھلملاتے رنگ بھرے ہیں۔اور اب یہ احساس قوی تر ہو گیا ہے کہ اس مقالے کو

تکمیل تک کے تمام مراحل سے گزار کر میں نے اپنا فرض منصبی اور شفقت کے سبھی تقاضے نبھانے میں کسی قسم کے تساہل کا مظاہرہ نہیں کیا۔

مشتاق عادل نے ''مراتب اختر'' کی ہمہ پہلو شخصیت پر تحقیقی کام کیا اور بعد ازاں اسے کتابی آہنگ عطا کر دیا، جو بین الجامعاتی و ادبی تاریخ کا حوالہ رہے گا اور ان کی موجودہ کاوش کو تاحدّ زیست دوام ملے گا۔

پروفیسر ڈاکٹر سید اشفاق حسین بخاری

صدر شعبہ اردو

ناردرن یونیورسٹی، نوشہرہ (خیبر پختونخواہ)

۳۱ مئی ۲۰۱۴ء

مراتب اختر (شخصیت وفن) پر ایک نظر

شیخوشریف کی سرزمین نے مراتب اختر اور ناصر شہزاد جیسے عظیم شاعروں کو جنم دیا ہے اور روحانی ومتصوفانہ روایات کو مستحکم کیا ہے۔لہلہاتے کھیتوں میں جو خوشبو سب سے زیادہ متاثر کن ہے وہ شیخوشریف کے مزارات پر عود وعنبر اور دیسی گھی کے جلتے چراغوں کی خوشبو ہے جس میں ادب وتصوف کا خوبصورت امتزاج ہے اور ایک عجیب روح پرور سرشاری پائی جاتی ہے۔

سید محمد حسین گیلانی کا نام بچپن ہی سے میری سماعتوں میں رس گھولتا رہا ہے۔ میرے بزرگوں کے پیر بلکہ بلوچوں کے پیر تھے۔میرے نانا منشی شہامد علی کے بھائی اور درویش صفت انسان میاں احمد بلوچ ان کے خاص مریدوں میں شمار ہوتے تھے۔ان کی وساطت سے مجھے نہ صرف اس روحانی ماحول کے بارے میں جاننے کا اتفاق ہوا بلکہ میں خود اس کا حصہ بھی رہا۔سید محمد حسین گیلانی کے وصال کے بعد ان کے صاحبزادگان میں سید مراتب اختر اور سید افضال حسین گیلانی کا ہماری جھوک میں مستقل ڈیرہ رہا۔سید مراتب اختر کے بارے میں بہت سی روایتیں اور حکایتیں سننے کو ملتی رہیں جن میں ان کی خوب صورت آنکھوں میں جلال و جمال، ان کا استغراق اور کم گوئی کے ساتھ ساتھ کم آمیزی کے بارے میں مریدین کے عقیدتوں سے بھرپور تبصرے اب تک میرے حافظے میں محفوظ

ہیں۔

ان کی شاعری مجھے متوجہ کرتی، اپنی طرف کھینچتی اور ہمیشہ fascinate کرتی رہتی ہے۔ میں ہمیشہ ان کے کلام کے کھوج میں رہا اور پھر ایک دن کلاسیک لاہور سے مجھے ''جنگل سے پرے سورج'' کا پہلا ایڈیشن مل گیا، میں نے اسے سوغات سمجھ کر بہت سنبھال کر رکھا اور زیرِ مطالعہ لاتا رہا۔ یک عجیب سرمستی، سرشاری اور روحانی اضطراب ہے، ان کی غزلوں میں جو مجھے پہلی قرأت سے لے کر اب تک اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔ پھر ''گنجِ گفتار'' کا تحفہ سید افضال حسین گیلانی نے اپنے دستِ مبارک سے عطا کیا اور بعدازاں سید عون الحسن غازی نے جب لاہور میں اس کی تقریبِ رونمائی کا اہتمام کیا تو زاہد حسن اور میں نے نہ صرف مضامین پڑھے بلکہ جہاں تک ممکن ہوا اس تقریب کے انعقاد میں معاونت بھی کی۔ ڈاکٹر خواجہ زکریا، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر ناہید شاہد نے بہ طور خاص اس تقریب میں مراتب اختر کے فکر وفن پر اظہار خیال کیا۔ بعدازاں یہ مضامین عون الحسن غازی نے نقدِ مراتب کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کر دیے۔ ادارہ صوتِ ہادی نے حسبِ مراتب، جنگل سے پرے سورج، گنجِ گفتار اور گزرا بن برسے بادل کے نام سے تفہیم مراتب اختر کے سلسلے میں اہم کتب شائع کی۔

جہاں تک اس اہم مقالے کا تعلق ہے اس کے موضوع سے لے کر تسوید متن تک کے مراحل میرے سامنے ہوئے ہیں۔ مشتاق عادل کاٹھیا اردو اور پنجابی کے اہم مصنف ہیں۔ سورج لبھدا سایہ، ساہیوال دے ہیرے ان کی پنجابی کتب ہیں جب کہ تاریخ ساہیوال اور قلم کا قرض اردو کی اہم کتابیں ہیں۔ مشتاق عادل ایک ہمہ دم مضطرب اور متجسس روح کا نام ہے جو ہمیشہ کسی نہ کسی علمی و ادبی سرگرمی میں محو دکھائی دیتی ہے۔ ''مہکاں'' رسالہ ہو یا مہکاں ادبی بورڈ کی علمی و ادبی تقربات، مختلف کتب کی اشاعت کا سلسلہ ہو یا آواز و آہنگ کی دنیا مشتاق عادل کاٹھیا اپنی مقدور بھر ادبی کاوشوں کے ساتھ ہمیشہ سرگرداں نظر آتے ہیں۔

مراتب اختر کا تعلق جدید تر شعرا کی نسل سے ہے جنھوں نے موضوعاتی اور اسلوبیاتی دونوں سطحوں پر تجربات کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مجید امجد کے زیر اثر ان کی غزل میں روشِ عام سے گریز اور نئے پن کا گہرا تخلیقی وفور موجود ہے۔ انھوں نے انگریزی اور پنجابی کے خوب صورت الفاظ کی پیوند کاری سے غزل کے دامن کو وسیع کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا یہ تخلیقی اجتہاد جہاں روایت پسند ناقدین مثلاً مثلاً نظیر صدیقی وغیرہ کی نظروں میں کھٹکتا ہے وہیں ''آٹھ غزل گو'' کے مرتب جاوید شاہین اور دیگر جدید دور کے شعرا کے نزدیک مستحسن اقدام گردانا جاتا ہے۔ مراتب اختر کے ہاں جذب و کشف کی کیفیات اتنی بھرپور اور توانا ہیں کہ ان کی شاعری کی زیریں سطح پر صوفیانہ فکر اور روحانی اضطراب سیلِ بیکراں کی طرح مچلتا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی نظموں میں بھی یہی کیفیت جلوہ افروز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجید امجد اور ناصر شہزاد کے ہم عصر اور ہم شہر ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ شعری لہجہ اپنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

مشتاق عادل کا ٹھیا چونکہ ساہیوال کی علمی و ادبی روایت سے بخوبی آگاہ ہیں اس لیے انھوں نے ایسے شاعر کو ایم فل سطح کی تحقیقی سرگرمیوں کے لیے موضوعِ بحث بنایا ہے جو اپنے اندر وسیع تر شعری امکانات رکھتے تھے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو مراتب اختر کا شمار مجید امجد، منیر نیازی، اسرار زیدی، جعفر شیرازی، حاجی بشیر احمد بشیر اور ناصر شہزاد وغیرہ کی صف میں ممتاز حیثیت کا حامل ہے جنھوں نے اپنی ادبی شناخت قائم رکھنے میں بھرپور شعری وسائل سے کام لیا ہے۔ سنتے ہیں کہ برگد کے نیچے کسی اور درخت کا پنپنا ذرا مشکل ہوتا ہے لیکن مجید امجد جیسے چھتنار برگد کے نیچے مراتب اختر ایک ایسا سرو آزاد ہے جو اپنی آزادیوں، رفعتوں اور چھاؤں کی سرخوشی میں مست ہے اور ہوا کے دوش پر عجب شانِ بے نیازی سے لہرا رہا ہے۔

مشتاق عادل کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے مرتب اختر جیسے درویش صفت جدید شاعر کو اپنا موضوع بنایا اور پھر اس موضوع کے ساتھ پورا انصاف بھی کیا۔ کاش کہ مجید امجد کی

طرح مراتب اختر کو بھی کوئی ڈاکٹر خواجہ زکریا جیسا مخلص اور بے لوث محقق اور نقاد میسر آ جائے جو ان کے کلام کی تدوین کرے اور ایک ایسا متوازن انتخاب سامنے لا سکے جو نہ صرف حسبِ مراتب ہو بلکہ حسبِ حال بھی ہو۔ مجھے امید ہے کہ مشتاق عادل کا اگلا منصوبہ یہی ہوگا اور وہ مراتب اختر کے کلام کا ایک معیاری انتخاب سامنے لانے میں کامیاب ہوں گے۔ سید افضال حسین گیلانی، سید علی ثانی گیلانی اور سید عون الحسن غازی کو اس مقالے کی اشاعت سے جتنی خوشی ہوگی میری خوشی ان سے فزوں تر ہے۔

ڈاکٹر اصغر علی بلوچ

استاد شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

۱۰ مئی ۲۰۱۴ء

مشتاق عادل کا تحقیقی کارنامہ

قیام پاکستان سے قبل ملی شاعری کے تصور سے وابستہ شاعروں کو چھوڑ کر اردو دنیا کے منظر نامے میں دو ادبی تحریکوں کو عروج حاصل تھا۔ جنہیں انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقہ ارباب ذوق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایک تحریک داخلیت اور ہئیت پرستی کی اسیر تھی اور دوسری ایک ایسے نظریے کی علم بردار تھی، جو ادب سیاست اور سماج میں صرف عمرانیات کو فوقیت دیتا تھا۔ پاکستان کی تشکیل کے پس منظر میں نظریہ پاکستان (جسے نظریہ اسلام بھی کہا جاتا ہے) تھا، اس لیے اوّل الذکر نے تو کسی نہ کسی طرح اپنے وجود کو برقرار رکھا اور جبکہ دوسری کی حکومتوں سے ٹھن گئی۔ حکومتی جبر کے تحت ترقی پسند تحریک کے وابستگان میں ایک فکری جانب داری پیدا ہوئی اور تحریک پابندیوں کی زد میں آ گئی۔ حلقہ ارباب ذوق نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ۱۹۵۸ء کے ایوبی مارشل لا نے شاعر اور ادیب کو عدم تحفظ سے دوچار کیا۔ اظہار کی آزادی پر پہرے لگ گئے، اس کے نتیجے میں ادب کے تمام ''ناشر الصوت'' علامتی انداز میں سُر بکھیرنے لگے۔ شاعری الفاظ کا گورکھ دھندہ بن کر رہ گئی، ہیئتوں کے تجربات نے روایت کے چہرے کو مکدر کیا، تو نئی لفاظی کی غیر متوازن'' چونچلالی'' نے تخلیق کے تمام سوتے خشک کر دیے۔ اس صورت حال میں عمومی رویوں میں چڑچڑاپن، مایوسی، اور روایت کی انحرافی صورتوں نے جنم لیا۔

اس عہد میں جوان ہونے والی نسل پر مادی نظریات کا غلبہ تھا۔ روایت سے بغاوت نے

زبان کی نئی تشکیل کی ضرورت پر زور دیا۔ ساٹھ کی دہائی میں ابھرنے والی اس تحریک نے ملکی سطح پر ایک حلقہء اثر پیدا کیا۔ اس تحریک میں بغاوت کے عنصر کی موجودگی کے باوجود بہت سے ایسے نام بھی سامنے آئے، جنھوں نے اصل معنوں میں شعروسخن کی خدمت کی۔ نئی لغت، نئی زبان، نئی الفاظ اور نئی ہئیت کی تبدیلی کو محض سلوگن بنانے کی بجائے، انھوں نے منفرد انداز میں الفاظ کے ذریعے رنگوں کی گل کاری کی۔ اس زمانے کے جدید تر شعرا میں سیّد مراتب اختر کا نام بھی سرفہرست ہے۔ اپنے شعری تجربات اور جدید فکر کی وجہ سے اس دور میں ان کی حیثیت منفرد اور جداگانہ لگتی ہے۔ سیّد مراتب اختر کی شاعری میں جدیدیت کے یہ تجربے محض زبان کی شکست وریخت کے حوالے سے نہ تھے، عین ممکن تھا یہ شاعری آئندہ کی تعمیر کا پیش خیمہ بنتی، لیکن قسّام ازل سے انھیں ملنے والی مختصر زندگی کے باعث ایسا نہ ہوسکا۔ مراتب اختر کی شاعری میں ایسے تجربات کی کمی نہیں جو اردو غزل کا عہد ساز لہجہ بننے کی صلاحیت رکھتے تھے، دو مثالیں دیکھیں:

اے تھکے ماندے، پسینے سے شرابور بدن
تو نے کل پھر اسی روداد کو دہرانا ہے

.....

کار خانوں کو چلے انبوہ در انبوہ لوگ
جان ور نکلے چرا گاہوں میں چرنے کے لیے

مراتب اختر شعری تہذیب کے پورے رچاؤ کے باوجود شہرتوں کی دنیا سے دور رہے، انھوں نے اپنے اعزاز میں جھوٹی تقریبات برپا نہیں کروائیں، دریوزہ گری کر کے ایوارڈز نہیں لیے، ولائتیں نہیں لوٹیں، البتہ شعر کا جو ''اکھوا'' ان کی ذات میں پھوٹا تھا، اس سے بہ ہر طور وابستہ رہے۔ شاعری کی ضرورت نہ رہی تو اس کو ''وبال جان'' نہیں بننے دیا۔ ترک لذات کے عمل سے گزرے اور بحرِ تصوف کے شناور بن گئے۔

سیّد مراتب اختر کی شاعری کے علمی تناظر میں، اس ضرورت کو محسوس کیا جاتا رہا ہے کہ ساٹھ کی دہائی میں ابھرنے والے اس ''خوش نوا شاعر'' نے اردو شاعری کو جو نیا لہجہ دیا تھا، اس کے آفاق کی وسعت کا جائزہ لیا جائے۔

مشتاق عادل نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے مراتب اختر کی ''حیات اور شعری

کائنات'' پرایک مدلل اورمبسوط مقالہ تحریر کیا ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ ایک سندی ضرورت کے تحت لکھا گیا ہے۔اس کے مندرجات سے اختلاف تو ہوسکتا ہے،لیکن اس کے موضوع کی جامعیت اورضرورت سے انکار ممکن نہیں۔

مشتاق عادل نے اس کتاب کومختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے، پہلے چھ ابواب میں میں شیخو شریف کا تاریخی پس منظر، خاندانِ مراتب اورادب، جن میں سیّد مراتب اختر کے عہد، حیات، شخصیت ، مراتب اختر کی شاعری کا پس منظر اور معاصر منظر نام، مراتب اختر کی غزل گوئی اور نظم گوئی اور علمی وادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان ابواب میں انھوں نے تمام مراجع اور منابع کی روشنی میں موضوع کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ساتویں باب میں مراتب اختر کو معاصرین کی نظر میں دیکھا گیا ہے جب کہ آٹھویں باب میں سید مراتب اختر کے ادبی مقام اور مرتبے کا تعین معروف ادیبوں اور دانشوروں کی آرا کی روشنی میں کیا گیا ہے۔نواں اور آخری باب اس تحقیق کا ماحصل بیان کرتا ہے۔

''مراتب اختر۔شخصیت وفن'' کافی عرق ریزی کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے۔اس میں موضوعہ شخصیت کے آباواجداد کے بارے میں تفصیلی تذکرہ پیش ہوا ہے۔احمد خان کھرل شہید اوران کے ساتھیوں کے آزادی کے حصول کے لیے انجام دیے جانے والے کارناموں اوران کے ساتھ مراتب اختر کے خانوادہ گیلانیہ کی شراکت کا احوال بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔بہتر ہوتا اس کتاب میں مراتب اختر کے ساہیوال میں قیام کے دنوں کے منقش منظروں کی عکس بندی بھی کردی جاتی۔مراتب اختر کا شمار مجید امجد کی ادبی کہکشاں کے روشن ستاروں میں ہوتا ہے،لیکن اس حوالے سے جامع حوالہ جات کا فقدان محسوس ہوتا ہے۔

لسانی تشکیلات کے تحریک کے تناظر میں مراتب اختر کی شاعری کا مطالعہ اس کتاب کا نسبتاً وقیع حصہ ہے۔ معاصر منظر نامے میں اس عہد کے دیگر جدید شعرا،انیس ناگی ،ظفر اقبال اورافتخار جالب وغیرہ کا تذکرہ بھی کتاب میں شامل ہے۔اس سلسلے میں یہ''اسم شماری'' اس منظر نامے کو واضح تو کرتی ہے،لیکن ان شعرا کے رجحانات ومیلانات کا مراتب اختر کی شعری فکر سے موازنہ کرنے سے مزید حسن پیدا کیا جاسکتا تھا۔علاوہ ازیں اس تحقیق میں مشاہیر کی آرا کے ذریعے مراتب اختر کے شعری وادبی مقام کا تعین کیا گیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی مشتاق عادل کا یہ تحقیقی کارنامہ ایک قابل ذکر کاوش ہے۔خود انکا اسلوب خاصا جان دار ہے، چند نمونے دیکھیے :

مراتب اختر ایک انسان دوست اور معاشرہ دوست فرد تھے۔وہ دنیا میں امن کے خواہاں تھے اس لیے انھوں نے اپنی شاعری میں اپنی ذات اور اس کائنات کے ساتھ مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کر کے امن کو برقرار رکھنے کا عزم ظاہر کیا۔

مراتب اختر کی غزلیات ان کے اظہار ذات کا وسیلہ نظر آتی ہیں۔انھوں نے اپنے تمام خیالات ،احساسات اور مشاہدات اس قدر سچائی سے بیان کیے ہیں کہ قاری کو اپنی آنکھوں کے سامنے ایک رنگا رنگ کہکشاں نظر آتی ہے۔

ایک کامیاب ادیب کی یہ خوبی ہے کہ وہ کتب بینی سے اپنا رشتہ نہیں توڑتا۔اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جس آدمی کا جتنا زیادہ مطالعہ ہوگا۔اسے اپنا مافی الضمیر اور مدعا بیان کرنے پر بھی دسترس ہوتی ہے۔سیّد مراتب علی اختر کے کلام کے مطالعے کے بعد یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ انہیں نہ صرف اردو بل کہ انگریزی،عربی ،اور فارسی زبان پر عبور تھا،اور ان کے کتب خانے میں ان علوم کی کتب کا ذخیرہ بھی موجود تھا۔

میری رائے میں زیر نظر کتاب ایک خاصا وقیع کام ہے۔ادبی حلقوں میں اس کی اشاعت کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔مراتب اختر پر آئندہ تحقیق کرنے والے اسکالرز کے لیے یہ کتاب ایک بنیادی حوالہ ثابت ہوگی۔کسی کتاب کے لیے اس سے بڑھ کر اور اہمیت کیا ہو سکتی ہے کہ لوگ تحقیق کے دوران اس سے استفادہ کریں۔

محمد افتخار شفیع
شعبہ اردو
گورنمنٹ کالج ساہیوال
۸ مئی ۲۰۱۴ء

مراتب اختر۔۔شخصیت وفن،مشتاق عادل کا تحقیقی معرکہ

شخصیات پر لکھنا، کہنا دراصل ان کو سمجھنا ہے۔اور ان کو سمجھنا کائنات کے بنیادی علوم سے ہے اور اس امر سے بھی مفر نہیں کہ یہ ایک فطری تقاضا اور عمل ہے۔چونکہ شخصیات نے علوم وفنون کو جنم دیا ہے کوئی بھی علم یا فن کسی شخصیت کو ابھار کے متعارف تو کرواسکتا ہے مگر جنم دینے سے قاصر ہے۔اسی طرح کوئی بھی فرد یا شخص کائنات کی بنیادی اکائی ہے۔

آج کے دورِمادیت میں جدیدیت زدہ اذہان ''علوم وفنون'' کے چکروں میں ''شخصیت'' کو نظر انداز کر کے کائنات کے فطری اور بنیادی اصول سے انحراف کر رہے ہیں۔

پاکستانی ادب میں، ساٹھ کی دہائی کی شخصیت شماری میں سیّد مراتب اختر ایک اہم نام ہے۔ جنہوں نے جدید لسانی تحریکات اور تشکیلات کے پیش نظر غزل کے بنیادی عناصر میں اہم تجربات کیے۔اوران شعراء کی فہرست میں شامل ہیں جو اپنے ان تجربات میں کامیاب ہوئے۔اپنے ہم عصروں میں مراتب اختر اس لئے بھی ایک معزز اور معتبر نام ہے انہوں نے چھپنے کی بجائے چُھپنے کو ترجیح دی مشاعروں سے گریزاں،شہروں کے شوراور شر سے دور پاکیزہ ادب تخلیق کرتے رہے۔

وہ 1988ء میں ادھورے تجربات کو چھوڑ کر راہی آخرت ہوئے۔تب سے اب تک مسلسل انکی ''شخصیت اور فن'' ادبی حلقوں اور تعلیمی اداروں میں موضوع سخن ہے۔مراتب اختر محض شاعر ہی نہیں اعلیٰ خوبیوں کے مالک ،دانشور، اور ایک بڑی خانقاہ کے نمائندہ ''پیر'' بھی تھے۔انکی شاعری بھی بیک وقت قدیم روایات کی مٹھاس اور جدید معاشرہ کی تلخیوں کی کڑواہٹ کا احساس لئے ہوئے ہے۔بقول احمد ریاض:

بس جائے تواک چوٹ ،بکھرجائے توخشبو
ہے تیری نظرپھول بھی نیزے کی اَنی بھی

مراتب اختر فطرت کے شاعر بھی ہیں ان کا فطرت کے ساتھ اس قدر گہرا رشتہ ہے کہ وہ کبھی یہ بھی کہنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔

بادل اس وقت نشیبوں میں اتر آئے تھے
اس سمے تیری ضرورت بھی کہاں رہنا تھی

یہاں میرا، ان کے شعروسخن پہ بات کرنے کا موقع نہیں بلکہ عزیزم مشتاق احمد امتیاز کے اس کام کو سراہنا ہے جو انہوں نے اپنے ایم۔فل کے مقالہ کیلئے مراتب اختر سیّد کے موضوع پر سرانجام دیا ہے۔

بطور شاعر انہوں نے اپنی تین کتابوں کو یادگار چھوڑا ''جنگل سے پرے سورج'' اور ''گنج گفتار'' جو غزلیات پر مشتمل ہیں۔ ''گزرا بن برسے بادل'' انکی نظموں کا مجموعہ ہے.....اور ''حصار حال ''حوادث زمانہ کی نذر ہوگئی۔

2006ء میں میری کتاب ''حسب مراتب'' شائع ہوئی جو اپنے موضوع کے اعتبار سے کافی ووافی تھی، ساتھ ہی عون الحسن غازی کی مرتبہ ''نقدِ مراتب'' ایک خاصے کی شئے ہے۔ بعدازاں اورینٹل کالج جامعہ پنجاب لاہور، شعبہ اردو کی ایک طالبہ اِرم آصف صدیقی (جو مشہور شاعرہ محترمہ تسنیم کوثر کی صاحبزادی بھی ہیں) نے 2006-2004 کے سیشن میں ایم۔اے کا ایک مقالہ ''مراتب اختر بطور شاعر'' کے نام پر پروفیسر ضیاء الحسن کی نگرانی میں مکمل کیا۔ اسکے فوراً بعد (نمل) یونیورسٹی اسلام آباد سے ایک طالبہ فلزہ ربانی نے ایم۔ اے کا دوسرا مقالہ بنام ''مراتب اختر کی شخصیت اور فن'' پروفیسر ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی نگرانی میں تکمیل کے مراحل سے گزارا۔

اب حال ہی میں (2014-2012) کے سیشن میں، محترم مشتاق احمد امتیاز نے نادرن

یونیورسٹی کی طرف سے پروفیسر سیّداشفاق حسین بخاری کی نگرانی میں اپناایم۔فل کا مقالہ تحریر کیا ہے۔موصوف ادبی دنیا میں مشتاق عادل کے نام سے موسوم ہیں۔ایک منجھے ہوئے اردو پنجابی کے ادیب،شاعر،نثر نگاراور سہ ماہی رسالہ ''مہکاں'' کے ایڈیٹر بھی ہیں۔انہوں نے ''مراتب اختر..... شخصیت وفن'' پراپنا تحقیقی اور تخلیقی کام مکمل کیا ہے۔

مطالعہ سے معلوم ہوا کہ مراتب اختر کی شخصیت کو جس بہتر انداز میں مشتاق عادل نے سمجھا ہے باقی مقالہ نگاراس سے قاصر رہے ہیں۔اسکی دو وجوہات ہوسکتی ہیں کہ مشتاق عادل کا رشتہ اسی شہر سے ہے جو شہرِ مراتب اختر ہے اور دوسرا کسی کی ذات تک پہنچنے کے لئے اسکو مسلسل سوچنا اور اپنی فکر میں بسانا پڑتا ہے۔مشتاق عادل کے اس مقالے نے آئندہ طالب علم کیلئے راہ خاصی ہموار کردی ہے۔کل کو کوئی اگراس موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھے گا تو اسکے لئے ایسی بنیاد فراہم ہوگی کہ تا اوج ثریا اسکے تعمیر کردہ محل میں کجی نہ آئے۔

مصنف کا قلم تیکھا اور حساس ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ایک شاعر کا کمال اس کی تخلیقی جدوجہد،نئی تراکیب سازی کے فن میں مضمر ہوتا ہے۔مراتب اختر اپنے عصری شعرا کی طرح نئی تشکیلات کی تخلیق سے بھی متاثر ہوئے اوران کی شاعری میں نئی تراکیب قاری کو تخیّل کی نئی دنیا میں پہنچادیتی ہیں۔

محقق نے ہر جگہ مراتب اختر کی شخصیت کے ساتھ پوری دیانت داری کا مظاہرہ کیا ہے۔اورانکی صلاحیتوں کا بہ نظرعمیق جائزہ لیا ہے۔دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> مراتب اختر کی شخصیت کے کئی روپ ہمارے سامنے آتے ہیں۔اس کے باوجود وہ منقسم شخصیت نہیں ہیں۔ان کے ہر روپ میں دوسرے سارے روپ پوری پوری طرح جذب ہیں۔وہ قادرالکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سچے پاکستانی، پکے مسلمان،انسان دوست،امن کے پیامبر،منفرد فنکار،صوفی منش ہستی اور مخلص دوست تھے۔ان کی شخصیت کے یہ سارے پہلوایک ہی منشور کے مختلف رنگ ہیں جو علیحدہ ہوکر بھی غیر منقسم رہتے ہیں۔ان کی زندگی میں کامل ہم آہنگی اوراعلیٰ درجے کا توازن ہے۔گوان کی زمانی ومکانی

حیات کا عرصہ بہت کم ہے مگران کی معنوی حیات واضح طور پرارضی ومادی حدود وقیود کو پھلانگتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

سیّد مراتب اختر کے کلام کے ساتھ ناقدری انکے دوست احباب سے بھی ہوئی، وہ ارباب ادب ودانش ہوتے ہوئی بھی انکے کلام کے ساتھ انصاف نہ کر سکے، بل کہ دنیائے ادب کے سامنے پیش کرنے سے بھی قاصر رہے اور کئی تو ''گنج مراتب اختر سے زادِراہ کی طلب میں، بعدازاں متاع کارواں کے ہی مالک ومختار بن بیٹھے۔

مشتاق عادل نے ہزارہا مشکلات ،نامساعد حالات، تعلیمی مصروفیات کے باوجود اس موضوع کے ساتھ عدل کیا ہے۔ وہ ایسے ہمت مرداں کے مالک ہیں کہ ادب کی خدمت کیلئے ہمہ دم تازہ دم ہیں۔

ایم۔فل کے مقالہ کے دوران بھی انکو خاصی مشکلات کا سامنا رہا کہ ''درِمراتب'' کی راہ دکھانے والے بعد میں خود ہی ''سدِ راہ'' بن گئے۔ اب تک شخصیات کی خدمت کرنے والے الٹے ''شخصیت پرستی'' کے آوازے کسنے لگے۔مگر مشتاق عادل نے ان تمام حالات کے ہوتے ہوئے اپنا کام کر دکھایا مبارک باد کے مستحق ہیں .....ساتھ ہی مجھے یہ فخر ہے کہ جو دیا میں نے ''سر راہ'' جلایا تھا اب اسی سے مزید چراغ جل اٹھے ہیں، جنکی ضو سے مراتب اختر سیّد کی شخصیت اور فن کے مزید گوشے روشن ہونگے اور عہد حاضر کا آئندہ شاعر اس میں مزید نئی جہتوں اور زاویوں کی تلاش کا سفر جاری رکھ سکے گا۔

سیّد سید علی ثانی گیلانی

شیخوشریف

15 مئی 2014

باب اول

شیخوشریف کا تاریخی پس منظر

شیخوشریف

شیخوشریف اوکاڑہ سے فیصل آباد جانے والی سڑک پر بنگلہ گوگیرہ سے 8 کلومیٹر شمال مشرق میں اوکاڑہ شہر سے تقریباً 30 کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ رینالہ خورد سے براستہ ستگھرہ بھی تقریباً اتنا ہی سفر بنتا ہے۔ یہ علاقہ کبھی ضلع ساہیوال میں شامل تھا جو ادب کے لحاظ سے مردم خیز سرزمین شمار کی جاتی ہے۔ مجید امجد، منیر نیازی، جعفر شیرازی، گوہر ہوشیار پوری، ظفر اقبال اور حاجی بشیر احمد بشیر جیسے نامور شعرا کے اس شہر کی بنیاد اس وقت رکھی گئی جب 1864 میں ریلوے لائن بچھ جانے کے بعد گوگیرہ سے ضلعی ہیڈکوارٹر منتقل کرتے ہوئے گورنر پنجاب سر رابرٹ منٹگمری کے نام سے نیا ضلع بنانے کا اعلان کیا گیا اور لاہور ملتان ریلوے لائن پر واقع ساہیوال کو منٹگمری کا نام دیا گیا۔ 1915 تک مختلف انتظامی تبدیلیوں کے بعد یہ ضلع تحصیل پاکپتن، تحصیل اوکاڑہ، تحصیل دیپالپور اور تحصیل منٹگمری کی شکل میں آچکا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس ضلع کے انتظامی ڈھانچے میں تو کوئی تبدیلی نہ ہوئی البتہ عوام کے پرزور اور دیرینہ مطالبہ پر 14 نومبر 1966 کو ضلع منٹگمری کا نام دوبارہ ساہیوال رکھ دیا گیا۔[1] یکم جولائی 1982 کو جب ضلع اوکاڑہ کا قیام عمل میں لایا گیا تو شیخوشریف کا علاقہ ضلع اوکاڑہ میں آ گیا۔

شیخوشریف کے گرد تاریخی مقامات

ستگھرہ

شیخوشریف سے جنوب مشرق میں 8 کلومیٹر کے فاصلہ پر ستگھرہ کا تاریخی قصبہ واقع ہے۔ ستگھرہ کو بعض جگہ صدگھرہ بھی لکھا گیا ہے۔ ستگھرہ اور صدگھرہ میں فرق صرف ''س'' اور ''ص'' کا ہے۔

مولانا نور احمد فریدی، قصرِ ادب ملتان والے ایک سن رسیدہ عالم اور جہاں دیدہ مورخ

تھے۔ان کی تحقیق ملاحظہ کی جائے تو یہ قصبہ پہلے ''ستگھرہ'' ہی کہلاتا تھا۔''ست'' کا معنی سچا اور ''گھرہ'' گھر سے نسبت ہے۔یعنی ''سچا گھر'' یہ قصبہ ہندوؤں کا ایک تیرتھ استھان تھا اور پورے ہند کے لئے عقیدت کا مرکز تھا جیسے کہ مسلمانوں کے لئے ''بیت اللہ''۔اور صاحب شجرۃ الانوار سید اصغر علی شاہ گیلانی لاہوری ثم پشاوری نے ''بالا پیر'' جناب کے ذکر اور گیلانی سادات کے حلب سے اُچ آنے اور اُچ سے ست گھرہ آنے کے ذکر میں اس کو صد گھرہ سے موسوم کیا ہے۔''س'' اور ''ص'' کے فرق سے ''صوتی'' لحاظ سے تو وہی نام کہنے سننے میں رہا لیکن ''س'' اور ''ص'' کے تبادلے نے واضح کر دیا کہ میر چاکر خان بلوچ کے حلیف ایک سو بلوچ گھر تھے جو خاندانی اور اعلیٰ بلوچ گھرانے یا قبائل تھے۔آج کے دور میں اس قصبہ کے اردگرد اُن ایک سو گھرانوں کی بستیوں کے آثار کھنڈرات، ٹبوں اور ٹیلوں کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ستگھرہ آج نہ تو ''ست گھرہ'' ہے نہ ''صد گھرہ'' رہا۔ایک وقت تھا جب لاہور اور ملتان کے درمیان یہ قصبہ معروف مقام تھا۔مغل بادشاہ بابر کے عہد میں مغل فوجوں اور پھر شیر شاہ سوری کے عہد میں پٹھان لشکروں کی مشہور اور آسان، لاہور اور ملتان کے درمیان ایک قریب ترین اور قدیم ترین گزرگاہ پر واقع ہے۔(۲)

۹۳۳ ہجری کے آخر تک ملتان کی لنگاہ سلطنت زوال پزیر ہونا شروع ہوئی تو نواب چاکر خان رند نے یہاں قابض ہونے کی پوری کوشش کی۔انہوں نے ستگھرہ کو پایہ تخت بنایا اور بلوچ سلطنت کی بنیاد رکھی۔وہ اس ریاست کی دلی تک وسعت کا خواہاں تھا مگر اس نے لاہور یا ملتان کو پایہ تخت بنانے کی بجائے ستگھرہ کو ترجیح دی۔میر چاکر خان نے پرانے ستگھرہ کے شمال میں لاہور ملتان گزر گاہ کے قریب نئے شہر کی بنیاد رکھی کیونکہ پرانا شہر تمام تر ہندوؤں کی آبادی پر مشتمل تھا۔لہٰذا مسلم آبادی کے لئے ایک نئے شہر کی ضرورت تھی تاکہ دونوں قومیں اپنے اپنے مذہبی رسم و رواج میں آزاد رہیں۔اس نئے شہر صد گھرہ کی مضبوط فصیل تھی اور اس کے اندر عالیشان محلات، دیوانِ عام و دیوانِ خاص تیار کروائے گئے۔دریائے راوی سے نہر کی طرز کی چھاڑیں نکلوائیں تاکہ دل کشا باغات اور بہترین

پھلوں کے لگوائے گئے پودوں کی سیرابی ہو سکے۔خوشنما پھولوں کے تختے سجوائے اور اس شہر کو بہشتِ بریں کا نمونہ بنایا گیا۔ اِن نہروں کے اردگرد نشیبی زمین کو قابلِ کاشت کروا کر غلّہ اور اجناس کی کمی کو فراوانی میں بدل دیا گیا۔ باقی جنگلات کو مال مویشی کی چراگاہ کے طور پر تحفظ دیا۔''ست گھرہ'' کی پرانی ہندو آبادی کے نشانات ایک تالاب شکستہ، ایک مڑھی اور اچھا رام کے شمشان یا سمادھی پر ایک شکستہ عمارت کی شکل میں آج کی آبادی کے جنوب میں موجود ہیں۔

مغل دور کے ستگھرہ کی ایک نشانی مرزا فرید بیگ کی قبر، میر چاکر خان کے قلعہ یا مقبرہ کے مغرب میں سیّد واجد علی شاہ، سیّد نادر علی شاہ مرحومین پسران سیّد کرم علی شاہ کے ڈیرہ میں مسجد کے قریب موجود ہے۔باقی بلوچ راجدھانی کے آثار دربارِاقدس بالا پیر امیر قدس اللہ کے ملحقہ قبرستان کے اردگرد چکوک 11/1-R,14/1-R,15/1-R,12/1-R,12/G-D کالے پور، موضع مردانی اور دیگر ملحقہ چکوک کی زرعی زمینوں میں ٹیلوں کی صورت میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ آثار تو تحصیل وضلع اوکاڑہ میں موجود ہیں۔اس سے آگے تحقیق شدہ مآثر تو لاہور اور ملتان کے درمیان اور بھی پائے گئے ہیں۔یعنی کوٹ میر چاکر، شاہو بلوچ، خان کمال، کوٹ میرن خان، گشکوری، گور گیجن یہ سب آبادیاں میر چاکر کے بیٹوں اور حلیف قبائل کے نام پر آج بھی موجود ہیں۔

گوگیرہ

شیخو شریف سے 8 کلومیٹر جنوب مغرب میں گوگیرہ کا شہر ہے۔ 1849 میں جب انگریزوں نے دریائے ستلج اور راوی کے درمیان کے علاقہ پر قبضہ کرلیا تو پاکپتن کو ضلع کا صدر مقام بنایا مگر صرف تین سال بعد دریائے راوی سے 8 کلومیٹر دور شیر شاہ سوری کی بنائی سڑک پر واقع گوگیرہ کو ضلعی صدر مقام بنایا اور اس کے ساتھ ہی موجودہ ضلع فیصل آباد، جھنگ اور شیخوپورہ کے 20 دیہات بھی ضلع گوگیرہ میں شامل کر دیئے۔اس وقت اس ضلع کی پانچ تحصیلیں تھیں۔تحصیل گوگیرہ، تحصیل ہڑپہ، تحصیل سیّدوالا، تحصیل حجرہ اور تحصیل پاکپتن پر مشتمل ضلع گوگیرہ کا صدر مقام 1864 تک گوگیرہ میں

رہا اور پھر ساہیوال تبدیل کر دیا گیا۔

جنگِ آزادی میں گوگیرہ کا کردار اور برکلے کا قتل

23 مئی 1857 کو لیفٹیننٹ الفنسٹن ڈپٹی کمشنر گوگیرہ کو ایک نیم سرکاری خط کے ذریعے اطلاع ملی کہ میرٹھ اور دہلی کے فوجیوں نے بغاوت کر کے تمام انگریز افسروں کو مار ڈالا ہے اس لئے میاں میر چھاونی لاہور کے دیسی سپاہیوں سے ہتھیار لے لئے گئے ہیں۔اسی دوران یہ خبریں اس علاقے کے رہنے والوں اور دیسی سپاہیوں تک بھی پہنچ گئیں۔لیکن اس سے پہلے کہ وہ منصوبہ بندی کرتے لیفٹیننٹ الفنسٹن نے بڑی چالاکی سے دیسی فوجوں سے اسلحہ واپس لے لیا۔اس وقت خزانے پر بھی دیسی فوج کا پہرہ تھا۔وہاں سے بھی اسے ہٹا دیا گیا۔خزانے پر کیپٹن ٹرانسن کی پولیس بٹالین کے 24 سپاہیوں اور ایک صوبے دار کی ڈیوٹی لگا دی اور جیل پر بابا سمیوان سنگھ اور کھیم سنگھ کے آدمی لگا دیئے گئے اور دیسی فوج کو کچھ دستوں کی حفاظت میں لاہور بھیج دیا۔ (۳)

ابتدا میں تو دہلی اور میرٹھ کے حالات سے یہاں کے لوگوں کو آگاہی رہی اور لوگوں کو جنگ کی ترغیب بھی دی جاتی رہی۔کہا جاتا ہے کہ رائے احمد خاں کھرل نے مقامی لوگوں کے کچھ دستے بنا کر دہلی بھی روانہ کئے بعد ازاں ڈاک پر پابندی لگ جانے کی وجہ سے لوگوں کو تازہ ترین صورت سے آگاہی ممکن نہ رہی۔اسی دوران کھرل برادری کا ایک آدمی جس کا نام شامند تھا سرسا جیل سے رہا ہو کر آیا تو اس نے روہتک، حصار، میرٹھ، دہلی اور دوسرے شہروں کے حالات مقامی لوگوں کو بتائے اور ساتھ ہی انہیں ذہنی طور پر جنگ لڑنے کے لئے تیار کیا۔شامند کی بتائی ہوئی باتیں بھی جلتی پر تیل کے مترادف تھیں لیکن لڑائی کا آغاز ''بیلی لکھوکا'' کے ایک گاؤں سے ہوا۔وہاں مالیہ کی وصولی کرنے والے سرکاری اہلکاروں کو لوگوں نے مالیہ ادا کرنے سے انکار کر دیا اور وہاں سے مار بھگایا۔اس واقعہ کے بعد سرکار نے جوئیہ قبیلہ کے مردوں عورتوں اور بچوں کو قید کر کے ان پر مظالم کے پہاڑ ڈھا دیے یہ خبر جب راوی کے غیور لوگوں تک پہنچی تو ان کے جذبات مزید بھڑک اٹھے۔رائے احمد خان کھرل نے ڈپٹی

کمشنر گوگیرہ لیفٹیننٹ الفنسٹن سے ملاقات کی اس ملاقات میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر برکلے بھی موجود تھا۔ برکلے نے کہا کہ اگر جوئیہ قبیلہ کے لوگ مالیہ کی ادائیگی کے لئے تیار ہو جائیں تو ان کی رہائی ممکن ہو سکتی ہے۔لیکن رائے احمد خان کھرل نے کہا کہ ان کے ذمہ گورنمنٹ کی کوئی رقم نہ ہے اور نہ وہ دینے کے لئے تیار ہیں اور آپ لوگوں نے انہیں رہا نہ کیا تو لوگوں کی ہمدردیاں جنگ آزادی کے مجاہدین سے اور زیادہ ہو جائیں گی۔رائے احمد خان کھرل کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور انہوں نے بغاوت کے ڈر سے اسی دن جوئیہ قبیلہ کے گرفتار شدگان کو رہا کر دیا۔

جوئیہ قبیلہ کے رہا ہونے والے افراد نے رائے احمد خان کھرل کو یہ بتایا کہ جیل کے اندر اور بھی بہت سارے بے گناہ قیدی موجود ہیں جن کا جرم یہ ہے کہ وہ بغاوت کے جذبات رکھتے ہیں۔

ان قیدیوں میں مراد فتیانہ کا ماموں دلاور فتیانہ بھی تھا۔رائے احمد خان کھرل نے جیل کے قیدیوں سے داروغہ حشمت علی کے ذریعے ملاقات کی۔ رائے احمد خان کھرل نے ان قیدیوں کو گڑ، تمباکو اور کھانے پینے کی اشیاء دیں اور ان کے ساتھ بات چیت کر کے جیل توڑنے کا منصوبہ بنایا۔رائے احمد خان کھرل کے جانے کے بعد جب برکلے نے قیدیوں کا معائنہ کیا تو گڑ وغیرہ اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں دیکھ کر اس کو رائے احمد خان کھرل کے جیل آنے کا پتہ چل گیا۔ برکلے نے اسی وقت داروغہ حشمت کو نوکری سے نکال دیا حشمت علی نے برکلے کو کہا کہ ''رائے احمد خان کھرل میرا سرپرست ہے اور میں اس کے ساتھ غداری نہیں کر سکتا۔''

8 جولائی 1857 کو سرکاری اہلکار پولیس ساتھ لیکر دوبارہ بیلی لکھو کا مالیہ وصول کرنے پہنچے تو وہاں کے لوگ بھاگ کر دریا عبور کر گئے اور وہاں سے مجاہدین اکھٹے کرنے کے بعد کشتیاں قبضے میں لے لیں اور پاکپتن پر حملے کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔

26 اور 27 جولائی کی درمیانی رات رائے احمد خان کے منصوبے کے مطابق سیاسی قیدیوں میں سے سرکردہ آدمیوں نتھو پروکا، ٹھوبہ رجوکا، سردارا بھوجوآنہ اور چاواوٹو نے گوگیرہ جیل توڑ کر

قیدی باہر نکالنا شروع کر دیئے ایک عورت کو دیوار عبور کراتے ہوئے اس کے بچے نے رونا شروع کیا تو جیل کے محافظوں کو پتا چل گیا اور انہوں نے گولی چلا دی۔ اس وقت سارے قیدی جیل سے باہر جیل کے احاطہ میں آ چکے تھے انہوں نے جیل کے محافظوں کے ساتھ جنگ شروع کر دی تو ان کی مدد کرنے کے لئے تھوڑی دور چھپے رائے احمد خان اور اس کے ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے اور انگریز سپاہیوں پر باہر سے حملہ کر دیا۔ بہت سارے قیدی انگریزوں کا گولہ بارود لے کر بھاگ گئے۔ اس لڑائی میں 145 قیدی مارے گئے اور ان کی لاشیں جیل کے قریب ایک کنویں (باگڑ کی ڈل) میں پھینک دی گئیں۔ 100 سے زیادہ انگریز سپاہی بھی مارے گئے جن میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ منچورڈ بھی شامل تھا جس کو رائے احمد خان کی چلائی ہوئی گولی لگی تھی۔ مسٹر برکلے اور کیپٹن رچرڈ نے اس ہنگامے پر قابو پا لیا۔ سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب تک یہ خبر پہنچی تو اس نے فوراً لیفٹیننٹ الفنسٹن کی جگہ میجر مرسڈن کو ڈپٹی کمشنر گوگیرہ تعینات کر دیا۔ چاواوٹو نے ایک سکھ کے گھر میں پناہ لی مگر سردار ابھو جوانہ نے مخبری کر دی۔ چاوا باہلک وٹو کی یقین دہانی پر برکلے کے سامنے پیش ہو گیا مگر اس کو پھانسی چڑھا دیا گیا۔ چاواوٹو کی پھانسی اور مرنے والے قیدیوں کی لاشوں کو کنویں میں پھینکنے کے واقعات کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف نفرت مزید بڑھ گئی۔

رائے احمد خان کھرل کو جیل میں بغاوت کے الزام میں گرفتار کیا گیا مگر جرم ثابت نہ ہونے پر اور بغاوت کے ڈر سے رہا کر دیا گیا مگر احمد خان اور اس کے سرکردہ ساتھیوں پر یہ پابندی لگا دی گئی کہ یہ لوگ گوگیرہ سے باہر نہ جائیں تا کہ یہ لوگ اکھٹے ہو کر بغاوت کی منصوبہ بندی نہ کر سکیں۔

اگست کا مہینہ پرسکون گزر گیا اور کسی قسم کی گڑبڑ نہ ہوئی البتہ اس عرصہ میں مجاہدین نے در پردہ جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مجاہدین کا مرکز تو جھامرہ تھا مگر پنڈی شیخ موسیٰ، محمد پور، ہڑپہ، چیچہ وطنی، مراد کے کاٹھیا، جلہی، گڑھ فتح شاہ اور بیلی لکھوکا میں مجاہدین کے کئی اجلاس ہوئے اور رائے احمد خان کھرل ہر جگہ لوگوں کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لئے پہنچا۔ جو قبائل ایک دوسرے کے دشمن تھے احمد

خان کے کہنے پر وہ بھی اختلافات بھلا کر ایک ہو گئے۔سوجا بھدرو نے بھی جگہ جگہ جا کر لوگوں کو آزادی کی جنگ کیلئے ابھارا۔ایک رات ''مراد کے کاٹھیا'' کے قریب رائے احمد خان کی سربراہی میں تمام قبائل کا اکٹھ ہوا جس میں کھیم سنگھ کا بھیجا ہوا ایک شخص ڈانگی سنگھ جو کوٹ دیوامل کا رہائشی تھا لڑائی کا نقشہ چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا جسے مسکین شاہ نے موقع پر ہی مار ڈالا۔ان دنوں ہی احمد خان کھرل اور مراد فتیانہ راتوں رات والئی ریاست بہاولپور ملک حاصل خاں کے پاس پہنچے اور وہاں سے سات بندوقیں لے آئے۔اس کے ساتھ ہی احمد خان نے کچھ ساتھیوں کو بندوقیں بنانے پر لگا دیا۔رائے احمد خان کی کوششوں پر جھنگ کے بھروانہ اور ساہیوال کی قومیں فتیانہ، ترہانہ، مردانہ، کھرل، وٹو، کاٹھیا، بگھیلا، جنجوعہ، لک اور نول لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو گئے۔احمد خان کے قبائل کے درمیان رنجش ختم کروا کر اتحاد قائم کرنے والے کاموں میں پیر نادر شاہ قریشی، ولی داد مردانہ اور مراد فتیانہ نے اہم کردار ادا کیا۔

کمالیہ میں اکٹھ

جب انگریزوں کو اپنے مخبروں کے ذریعے پتہ چلا کہ راوی کے جیالے مجاہد در پردہ ایک بڑے حملے کی تیاری کر رہے ہیں تو وہ گھبرا گئے اور تمام سرداروں کی طرف پیغام بھیجا کہ 17 ستمبر 1857 کو سرفراز خان کھرل کے ڈیرے پہ آ کر حکومت سے بات چیت کریں۔دراصل انگریز آزادی کے اس قافلے کے قائدین کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانا چاہتے تھے مگر مجاہدین کے رہنما اس چال کو سمجھ چکے تھے اس لئے انہوں نے ایک دن قبل 16 ستمبر کو سرفراز خان کے ڈیرے پر اپنا اکٹھ کر لیا اور اس اکٹھ میں تمام سرداروں نے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر حلف دیا اور دوسرے دن باقاعدہ حملہ کا منصوبہ بنا کر اپنے اپنے علاقوں کو چل پڑے مگر سرفراز خان اور ماچھیانگڑیال حلف سے منحرف ہو گئے اور انگریز سرکار کو مخبری کر دی جس پر انگریز فوجیں فوراً حرکت میں آ گئیں۔

انگریزوں نے کمالیہ کی حفاظت کیلئے ایک گھوڑ سوار دستہ بھیجا۔ملتان اور ہڑپہ کے کمشنروں کو

تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرنے کے لئے دو قاصد روانہ کیے جنہیں محمد پور کے نزدیک مردانوں نے قتل کر دیا اور سرکاری خطوط جلا دیے۔ پورا ضلع میدان جنگ بن چکا تھا انگریزوں نے بھی ہاتھ پاؤں مارے بلکہ ایک قاصد پھر ہڑپہ روانہ کیا۔ سارا سرکاری ریکارڈ اور قیدی تحصیل کی عمارت میں لائے گئے تاکہ زیادہ بہتر انداز سے دفاع کیا جا سکے۔ اسسٹنٹ کمشنر برکلے کی سربراہی میں ایک دستہ رائے احمد خان کی گرفتاری کیلئے روانہ ہوا تاکہ احمد خان کو دریا عبور کر کے جھامرہ پہنچنے سے پہلے ہی گرفتار کر لیا جائے لیکن احمد خان اس دستے کے پہنچنے سے پہلے ہی دریا عبور کر گیا اور دریا کے دوسرے کنارے کھڑے ہو کر رائے احمد خان نے برکلے کو للکارا کہ وہ انگریزوں کو اس سرزمین سے نکالے بغیر نہیں بیٹھے گا۔

17 اور 18 ستمبر 1857 کی درمیانی رات کو برکلے اور لیفٹیننٹ الفنسٹن نے مل کر جھامرہ پر حملہ کر دیا احمد خان نے جب بہت زیادہ فوج دیکھی تو کچھ دیر مقابلہ کرنے کے بعد وہاں سے نکل گیا۔ انگریزوں نے جھامرہ کو آگ لگا دی اور مرد، عورتیں، بچے اور مال ڈنگر پکڑ کر لے گئے۔ اس واقعہ کے بعد کھرلوں کے کچھ خاندانوں نے احمد خان کو آزادی کی جنگ لڑنے سے جواب دے دیا البتہ وٹو، فتیانہ، کاٹھیا اور دیگر اقوام اس کے شانہ بشانہ کھڑی تھیں۔

18 ستمبر 1857 کو مجاہدین اکبر کے نمبر دار جیوے خاں کو لوٹنے کے لئے اکٹھے ہوئے مگر برکلے کی بروقت مدد کی وجہ سے وہ بچ گیا۔ برکلے نے دہشت پھیلانے کے لئے پنڈی شیخ موسیٰ کو آگ لگا دی۔ ایسے حالات دیکھ کر مجاہدین نے گوگیرہ پر حملہ کا پکا ارادہ کر لیا۔ 20 ستمبر کو مجاہدین نے گوگیرہ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اسی دن ڈپٹی کمشنر لیفٹیننٹ چیسٹر کے بلانے پر برکلے بھی واپس گوگیرہ آ گیا اور اس دن لاہور سے کرنل پیٹن بھی اپنی سپاہ اور توپیں لے کر پہنچ گیا۔ مجاہدین جب گوگیرہ کے پاس پہنچے تو انگریز سپاہ نے اپنی توپوں کے منہ کھول دیے۔ مجاہدین کے پاس صرف لاٹھیاں، کلہاڑیاں اور برچھے وغیرہ تھے۔ جب سامنے سے زبردست گولہ باری ہوئی تو وہ

آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے اور فتح پور کے جنگل میں جا چھپے۔ (۴)

مجاہدین پچھلے کچھ دنوں سے چک نمبر 20 گشکوریاں میں ایک ویران جگہ ''نورے کی ڈل'' پر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے مگر ڈھارا سنگھ کے ملازمین نے مخبری کر کے انگریزوں کو اس تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا تو انگریز یہاں حملہ آور ہو گئے۔ کیپٹن بلیک گھوڑ سوار دستہ کے ہمراہ حملہ کے لئے تیار تھا اور لیفٹیننٹ چیسڑ اس کے ساتھ تھا۔ وہ مسلح بہ آتشیں اسلحہ تھے جبکہ مجاہدین کے پاس روایتی ہتھیار لاٹھیاں اور برچھے وغیرہ تھے مگر مجاہدین دفاع کرنے میں کامیاب رہے اور کیپٹن بلیک اپنے بہت سارے سپاہی مروا بیٹھا۔ اب کیپٹن مچل تازہ دم فوج جس میں سکھ سپاہیوں کی پوری بٹالین تھی لیکر آیا بڑے گھمسان کی جنگ ہوئی۔ مجاہدین بڑے حوصلہ سے لڑے۔ 20 پرائیں ڈھول بجا بجا کر مجاہدین کے حوصلے بڑھاتے رہے۔ رائے احمد خان کھرل اور اس کا بیٹا محمد خاں، کلو، کرم علی، دانا، کھنا، سارنگ، جھنڈا، باہلک، رحم، عبدل فتیانہ، نواب، میاں نبی بخش اور جمانہ ولد بیگا اس بے جگری سے لڑے کہ آج بھی یہ سرزمین ان پر فخر کرتی ہے۔

رائے احمد خان کھرل نماز عصر پڑھ رہے تھے کہ ڈھارا سنگھ اور کھیم سنگھ نے رائے احمد خان کی طرف اشارہ کر کے انگریزوں کو اس کی پہچان کروا دی تو انگریز فوج کے سپاہی گلاب رائے بیدی نے گولی مار کر احمد خاں کو زخمی کر دیا رائے احمد خان اٹھ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہونے لگا تو ڈھارا سنگھ اور کھیم سنگھ نے انگریزوں سے کہا کہ احمد خان گھوڑے پر سوار ہو گیا تو تمہاری خیر نہیں۔ گلاب رائے نے دوسری گولی ماری جس سے آزادی کا یہ متوالا شہید ہو گیا۔ انگریز احمد خان کھرل کا سر کاٹ کر گوگیرہ لے گئے اور مجاہدین اس کا دھڑ اٹھا کر جھامرہ لے گئے۔ انگریزوں نے بیگا ولد سارنگ کا بھی سر کاٹ لیا اور نمائش کیلئے یہ دونوں سر گوگیرہ جیل کی دیوار پر رکھ دیے مگر رات کو ایک مراثی یہ دونوں سر چرا کر جھامرہ پہنچ گیا اور یہ سر دھڑ سے علیحدہ دفنائے گئے۔ 1976 میں جب رائے احمد خاں کھرل کا مقبرہ بنا تو سر کو بھی وہاں سے نکال کر دھڑ کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ رائے احمد خان کھرل کی شہادت کے بعد علاقے کے

لوگ سر پر کفن باندھ کر نکل آئے اور انگریزوں نے بھی ظلم وستم کی انتہا کر دی۔

برکلے جس کو معرکہ گشکوریاں کے دن (21 ستمبر کو) گوگیرہ اور ملتان کے درمیان رابطہ بحال کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا وہ راستے کی تمام آبادیوں کو نذر آتش کرتا ہوا ہڑپہ کی طرف بڑھا۔نور شاہ کے قریب ''میاں مستانہ'' کے دربار کو جلانے کے بعد ''کوڑے شاہ'' کی آبادی کی طرف پلٹا اور ''مہر شاہ'' والے پتن کے قریب ڈیرہ لگایا۔مجاہدین کو بھی اس بات کی اطلاع مل گئی وہ پہلے ہی رائے احمد خان کی موت کا بدلہ لینے کے لیے بے چین تھے لہٰذا جلہی ،گڑھ فتح شاہ اور محمد پور سے سارے مجاہدین کوڑے شاہ جمع ہو گئے۔یہاں پر مجاہدین کی تعداد پہلی تمام لڑائیوں سے زیادہ تھی۔22 ستمبر کو جب برکلے کوڑے شاہ سے محمد پور کی طرف کوچ کرنے کے لئے تیار ہوا تو اِسے جنگل میں چھپے مجاہدین کی مخبری ہوئی وہ جنگل کی طرف بڑھا جہاں مجاہدین نے اس کی فوج پر حملہ کر دیا عصر تک لڑائی ہوتی رہی۔ برکلے لڑتا لڑتا دریا کے بیٹ میں پہنچ گیا جہاں اس کا گھوڑا دلدل میں پھنس گیا اتنے میں مراد فتیانہ نے اس پر نیزہ سے وار کیا اور نیزہ اس کی ذرہ چیرتا ہوا پسلیوں سے پار ہو گیا۔برکلے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور زمین پر گر پڑا۔اس کے زمین پر گرتے ہی سوجے بھدرو اور اس کے بھائیوں نے لاٹھیوں کے وار کر کے برکلے کو جہنم واصل کر دیا۔اس معرکہ میں انگریزوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ولی داد مردانے نے بیسیوں فوجیوں کے سر اتار کر دریا میں پھینکے۔فتیانے اور ترہانے برکلے کا سر نیزے پر چڑھائے ڈھول بجاتے شام ڈھلے جلہی جا پہنچے۔

انگریز سرکار کو جب برکلے کی موت کی خبر پہنچی تو مخبروں نے بتایا کہ اس وقت مجاہدین کی تعداد سوا لاکھ کے قریب ہے اور وہ سیّدوالا سے لے کر تلُمبہ تک کا علاقہ آزاد کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ساتھ یہ خبر بھی پہنچی کہ 17 ستمبر سے تحصیل ہڑپہ پر کاٹھیے قابض ہو چکے ہیں۔اس پر انگریز سرکار نے کمشنر جھنگ،کمشنر لاہور،کمشنر ملتان کے علاوہ شورکوٹ لیہ اور گجرانوالہ کی فوجی چھاونیوں سے امداد طلب کر لی۔23 ستمبر کو لیفٹیننٹ الفنسٹن ،کیپٹن بلیک اور چیسرٹ محمد پور پہنچے۔محمد پور کو تیسری مرتبہ نذر

آتش کیا اور 25 ستمبر کو ہڑپہ پہنچ کر ہڑپہ آزاد کروایا۔ مجاہدین نے ہڑپہ سے نکل کر پرانی چیچہ وطنی کے قریب ملتان سے آنے والے میجر چیمر لین کو گھیر لیا جس نے اپنی جان بچانے کے لیے ایک سرائے میں پناہ لی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب انگریزوں کو اپنی جان بچانا بھی مشکل ہوگئی ہے۔ اس جنگ میں مسلمان خواتین نے بھی مجاہدین کا برابر کا ساتھ دیا۔ میجر چیمر لین نے ملتان اور لاہور کی فوجی چھاؤنیوں کو مدد کی درخواست کی۔ 26 ستمبر کو کرنل پیٹن چیچہ وطنی کی طرف روانہ ہوا تو راستہ میں مجاہدین نے اس پر گوریلا طرز کے حملے کر کے اس کی فوج کو بھاری جانی نقصان پہنچایا۔ کرنل پیٹن چیچہ وطنی پہنچنے میں کامیاب ہو گیا مگر اپنے بھاری توپ خانہ کے باوجود چیمر لین کو آزاد نہ کرا سکا۔ کیپٹن سنو اور کمانڈر میک اینڈریوز بھی اپنے دستے لے کر چیچہ وطنی پہنچ گئے۔ بندوقوں اور توپوں سے مسلح انگریز فوج برچھیوں، لاٹھیوں اور نیزوں سے مسلح کاٹھیوں سے 25 ستمبر سے یرغمال بنائے میجر چیمر لین کو 29 ستمبر کو بڑی مشکل سے رہا کروانے میں کامیاب ہوئی۔ کرنل پیٹن اور کیپٹن سنو کو واپسی پر محمد پور کے قریب مجاہدین نے بہت نقصان پہنچایا اور کیپٹن سنو زخمی ہو گیا۔ اس کے بعد مجاہدین نے جھنگ سے آنے والے کیپٹن ٹرانسن کی فوج پر بھی گوریلا حملے کیے مگر بھاری توپ خانے کی وجہ سے کامیابی نہ ہو سکی۔

اب تمام مجاہدین جلہی میں فتیانوں کے پاس جمع ہونے شروع ہو گئے۔ جب انگریزوں کو اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے بھی جلہی کی طرف پیش قدمی شروع کر دی اور میجر چیمر لین کیپٹن سنو میجر ہملٹن اور میجر مرسڈن کی سپاہ نے جلہی کو گھیرے میں لے لیا۔ صرف لنگڑیال قبیلہ ہی انگریزوں کے ساتھ تھا باقی تمام قبائل متحد تھے۔ انگریز فوج توپوں اور بندوقوں سے لیس تھی جب کہ مجاہدین آتشیں اسلحہ نہ ہونے کے باوجود جذبہ آزادی سے سرشار مقابلہ کر رہے تھے اور گولے برساتی توپوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دشمنوں پر گوریلا حملے کر کے ان کے سپاہیوں کو جہنم واصل کر رہے تھے۔ جونہی موقع ملتا توپوں کے منہ گھاس پھوس سے بھر دیتے۔ ان مجاہدین نے 20 دن تک توپوں کا مقابلہ صرف

لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے کیا اور کئی بار حملہ آور فوج کو واپسی پر مجبور کر دیا۔اس بات سے پریشان ہو کر انگریزوں نے ملتان اور گوگیرہ سے مزید مدد کی درخواست کی تو ملتان سے کیپٹن ڈیلین مزید توپیں لے کر پہنچ گیا۔

23 اکتوبر کو تمام انگریز افسروں نے پوری تیاری سے جلہی پر حملہ کر دیا۔یوں محسوس ہوتا تھا کہ پورے پنجاب کی توپوں کا منہ جلہی کی طرف تھا اور مجاہدین لاٹھیوں اور برچھیوں سے مقابلہ کر کے توپوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔اس زبردست حملہ میں انگریزوں نے جلہی کی اینٹ سے اینٹ بجادی مگر انگریزوں کو ماسوائے ان ڈھول بجانے والوں کے کچھ ہاتھ نہ آیا جنہوں نے ڈھول بجا بجا کر مجاہدین کو وہاں سے نکل جانے کا موقعہ فراہم کیا۔انگریزوں نے ان ڈھول بجانے والوں کو پکڑ کر توپوں سے اُڑا دیا۔

انگریز فوج مجاہدین کا پیچھا کرتی ہوئی 24 اکتوبر کو ہڑپہ پہنچی،25 کو کمیر،26 کو جیون شاہ،27 اکتوبر کو شیخو (شیخو پر دو بار چڑھائی کی گئی کیوں کہ رائے احمد خان، شیخو کے سید عبدالرزاق سجادہ نشین چہارم کا مرید تھا)28 اکتوبر کو رسول پور میں پڑاؤ کیا۔آخر کار میجر مرسڈن نے کچھ چرواہوں کو لالچ دے کر مجاہدین کے ٹھکانے کا پتہ لگا لیا۔جہاں حملہ کرنے پر کچھ مجاہدین شہید ہو گئے اور کچھ نے بھاگ کر جان بچائی۔

نتھو اور رجب کاٹھیا 7 نومبر کو گرفتار ہوئے جبکہ مامند کاٹھیا پہلے ہی گرفتار ہو چکا تھا۔12 نومبر کو آزادی کے دوسرے قائدین نے بھی گرفتاری دے دی جن میں نادر شاہ قریشی، ولی داد مردانہ، موکھا وہنوال ، ماجھی بشیرا شامل تھے۔11 جنوری کو بہاول فتیانہ بھی لڑتا ہوا گرفتار ہو گیا۔انگریز سرکار نے ان لوگوں سے لاکھوں روپے جرمانہ وصول کیا۔کئی لوگوں کو تختہ دار پر چڑھا دیا گیا بہت سے لوگ قیدی کر لئے گئے اور کچھ کو ضلع بدر کر دیا گیا۔کافی لوگوں کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں اور کئی لوگوں کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔

موکھا وہینوال، ولی دادمردانہ، ماجھی بشیرا، لال ولدگا جی کاٹھیا، محمد یار مردانہ، رحمت خان، قادامردانہ اور دوسرے مجاہدین کو کالے پانی بھیج دیا گیا۔ جب جہاز سمندر میں کچھ فاصلے پر گیا تو سب مجاہدین نے وہاں سے بھاگ جانے کا منصوبہ بنالیا مگر ماجھی بشیرے نے کہا کہ ''میں مخبری کر دوں گا'' اس بات پر موکھے وہینوال نے ولی دادمردانے کو کہا کہ تو ماجھی کی منت کر۔ ولی داد نے اپنے ہاتھ ماجھی کی طرف بڑھائے اور کہا ''دوست ایسے نہیں کرتے'' اور ساتھ ہی اس کی گردن پکڑی اور اسے مار کر سمندر میں پھینک دیا اور باقی سب لوگوں نے جہاز سے چھلانگیں لگا دیں۔ کئی دن سمندر میں تیرنے کے بعد کنارے لگے اور چھپتے چھپاتے گھروں تک پہنچے۔ ولی دادمردانہ مخبری ہو جانے پر پھر گرفتار ہو گیا اور بعد میں موکھا وہینوال بھی پیش ہو گیا اور اس طرح انگریز ضلع ساہیوال پر قابض ہو گئے۔

شیخوشریف کے اردگرد اقوام

بلوچ

اس قوم کا اصل وطن تو مکران تھا مگر بعد میں یہ قوم کوہ سلیمان کے زیریں علاقے پر قابض ہو گئی۔ بلوچوں کی بہت ساری گوتیں ہیں۔ بلوچ سردار جلال خان کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹوں کے نام رند، ہوت، لاشاری اور کورائی تھے جبکہ بیٹی کا نام جاٹو تھا۔ یہ پانچ ہی تھے جن کے ناموں پر گوتیں بنیں۔ اب تک ان گوتوں کو انہیں ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بلوچوں کی کئی اور گوتیں بھی ہیں۔ بلوچ اپنا سلسلۂ نسب حضرت امیر حمزہ سے بتاتے ہیں۔ مگر کچھ بلوچ اس بات سے اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت امیر حمزہ کی کوئی اولاد نہ تھی اُنکا سلسلہ نسب حضرت ابراہیمؑ سے ملتا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی مگر مجھے اس دعوے کا کوئی ثبوت نہ ملا اور نہ ہی دعوے دار اس کا ثبوت فراہم کر سکے۔ تاہم ان کے عربی النسل ہونے میں کوئی شک نہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بلوچ اصل میں حلب کے مقام پر آباد بلوس قوم کے موجودہ جانشین

ہیں۔ جو عراق سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور مقامی زبان میں بلوس کی بجائے بلوچ مشہور ہو گئے۔ پرانی روایات کے تحت بلوچ قبائلی وفاداری کے پابند ہیں۔ قبیلے کے سردار کا فیصلہ معاملات کے تصفیہ کے لئے قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ بلوچ مہمان کے تحفظ اور تواضع کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ دشمن پر چھپ کر وار نہیں کرتے۔ درمیانہ قد، بہادر اور اعتدال پسند ہیں۔ بلوچوں کے چہرے لمبے اور بیضوی، نقوش تیکھے، داڑھی اور مونچھیں گھنی اور سر کے بال لمبے اور گھنگریالے ہوتے ہیں۔ ذہین اور اپنے آپ کو حالات کے سانچے میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

> 1555 میں ایک بلوچ سردار مغل بادشاہ ہمایوں کے ہمراہ ہندوستان آیا۔ ہمایوں کے دوبارہ ہندوستان فتح کرنے میں بلوچوں کے مدد کرنے کے صلہ میں میر چاکر کو ساہیوال کا علاقہ بطور جاگیر ملا۔ ویسے تو پنجاب میں بلوچوں کی مشہور گوتیں لغاری، دریشک، گوپنگ اور جتوئی ہیں۔ تاہم علاقہ ساہیوال میں جتوئی، رند اور گادھی بلوچ آباد ہیں۔ گادھی بلوچوں کو دوسروں کے مقابلہ میں بہتر کاشتکار بتایا گیا ہے۔ ایبٹسن نے اس قوم کو درج ذیل الفاظ میں سراہا ہے ''حالت جنگ میں بھی دشمن کی عورتیں اور بچے بلوچوں کی تحویل میں محفوظ ہوتے ہیں۔ (۵)

شیخوشریف کے نواح میں دریائے راوی کے کنارے موضع شہامند بلوچ، داد بلوچ اور چک خان کمال میں بلوچ کثرت سے آباد ہیں۔ دوسری طرف چک 15/7-R اور شمال مغرب میں بلوچوں کی مشہور جھوکیں ہیں۔ جن میں جھوک آہلو، شہامند کی جھوک اور میر کی جھوک زیادہ مشہور ہیں۔

کھرل

کھرل راجپوت الاصل ہیں اور اپنا تعلق بھوپا سے جوڑتے ہیں۔ جو راجہ کرن کی پشت سے تھا اور اُس نے حضرت جہانیاں جہاں گشت کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا تھا اور بقیہ زندگی مرشد کے شہر اُچ شریف میں گزار دی۔ عہد عالمگیری میں کمالیہ کے کھرلوں کو اہمیت رہی۔ جنگِ آزادی 1857ء میں سرفراز خاں کھرل تو انگریزوں کا ساتھی تھا مگر باقی قوم رائے احمد خاں کھرل کے زیر

قیادت راوی کی دوسری غیور ذاتوں کے ساتھ مل کر انگریزوں سے برسر پیکار رہی۔

الفنسٹن کھرل قوم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ سرکشی اور حوصلہ مندی میں کاٹھیا قوم کے علاوہ یہ سب ذاتوں سے سبقت رکھتی ہے۔ کھرلوں کا قد وقامت دیگر ذاتوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ محنتی اور جفاکش ہیں۔ (۶)

علاقہ میں رہائش پذیر کھرلوں کی ذیلی اقوام کے حوالے سے یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ بشیرا، پربیرا، ربیرا، ساہی، پروکا، جلوکا اور سبوکا برادریوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ شیخوشریف کے قریب راوی کے کنارے جھامرہ، موضع چوکھنڈی، چک بشیرا، چک بلوانہ، ٹبی پربیرا، موضع سبوکا اور چک 55/G-D کے علاقے میں کھرل قوم آباد ہے اور علاقائی سیاست میں اس قوم کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔

وٹو

شیخوشریف کے نواح میں آباد قوموں میں وٹو قبیلہ بھی قابل ذکر ہے۔ وٹو قوم کے متعلق مشہور ہے کہ سیالکوٹ کی بنیاد رکھنے والے راجہ سالہان یا سہلوان کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا دیپا چند تھا جس نے دیپالپور کی طرح ڈالی جبکہ چھوٹا بیٹا سرسا تھا۔ سرسا راجہ کی بے شمار رانیاں تھیں اس نے ہندوستان میں ضلع حصار میں سرسا رانیاں کی بنیاد رکھی اور اپنے نام کے ساتھ سرسا رانیاں کہلانا فخر محسوس کیا۔ راجہ سرسا کی جتنی رانیاں تھیں سب سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئے۔ سرسا رانیاں کا علاقہ زیادہ تر اس وقت بارانی ہی تھا اور بارشوں کے ہونے پر یہاں کے لوگ بارانی رقبہ میں فصلات باجرا، کنگنی، جو، چنے اور دالیں کاشت کرتے۔ انہی فصلات پر ان کی زندگی کا انحصار تھا یا پھر جانور پالنا بھی ان کا پیشہ تھا۔ زمانہ گزرتا گیا آخر کار اس علاقہ میں کئی سال بارشیں نہ ہوئیں اور اس خطہ میں قحط پڑ گیا تو اس راجہ سرسا کی اولاد نے جو کئی گھروں اور افراد پر مشتمل تھے نقل مکانی کر کے دریائے ستلج کے کنارے بنگلہ فاضلکا اور اس کے مضافات میں آ کر ڈیرے ڈالے۔ چونکہ دریائے ستلج کے دونوں کناروں پر پہلے

سے بھٹی راجپوت آباد تھے اس لئے وہ آنے والے راجپوتوں یعنی سرسا راجہ کی اولاد کا وجود برداشت نہ کر سکے اور انہیں مار بھگانے کے لئے ان پر حملہ کر دیا۔ جب آنے والے راجپوتوں نے دیکھا کہ ان پر بلاوجہ اور اچانک حملہ کیا گیا ہے تو انہوں نے ان بھٹی راجپوتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بڑی خون ریز جنگ کے بعد ہر دو قبیلوں کے سرداروں نے صلح کے پیغام ایک دوسرے کی طرف بھیجے تو ان قبیلوں کے مابین ایک صلح کا معاہدہ طے پا گیا۔ معاہدہ میں طے پایا کہ دریائے ستلج کا شرقی کنارہ آنے والے راجپوتوں کی ملکیت ہوگا اور غربی کنارہ بھٹی راجپوتوں کا رہے گا۔ یہ بھی طے پایا کہ کسی بھی قبیلہ کے جانور یا آدمی دوسرے قبیلہ کے علاقہ میں چلے جائیں تو وہ اس معاہدہ کے تحت واپس کرنے ہوں گے۔ کچھ عرصہ اس معاہدہ پر قائم رہنے کے بعد شرقی کنارے کے راجپوتوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور بھٹی راجپوتوں کے جانور اور آدمی جو دریا پار شرقی کنارے پر چلے گئے تھے واپس دینے سے انکار کر دیا۔ جس پر بھٹی راجپوتوں نے کہا کہ شرقی راجپوتوں نے ان پر اچانک جنگ کرنے کا اپنے دلوں میں وٹ رکھ لیا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے معاہدہ صاف دل سے نہیں کیا بلکہ ''وٹ'' یعنی رنج رکھا۔ بعد میں بھٹی راجپوتوں نے شرقی راجپوتوں کو وٹ والے راجپوت کہنا شروع کر دیا اور پھر بگاڑ پیدا کر کے مقامی لوگ انہیں وٹو کہنے لگے۔

> راجپوت وٹو کئی گوتوں میں ہیں اور یہ سب گوتیں اپنے اپنے سرداروں جو راجہ سرسا کے بے شمار بیٹوں کے ناموں پر ہیں۔ مثال کے طور پر راجپوت وٹو تیچکا، وٹو ٹھکر کا، راجپوت وٹو لادھو کے، راجپوت وٹو مالے کے، راجپوت وٹو بجیدے کے وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان راجپوت وٹوؤں کو حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ نے مشرف بہ اسلام کیا اب بھی یہ راجپوت وٹو دریائے ستلج کے کنارے اور اس کے مضافات میں کئی دیہاتوں میں آباد ہیں۔ (۷)

جنگِ آزادی کے آغاز 1849ء میں راجپوت وٹو قبیلہ کے کچھ جانبازوں نے رائے احمد خاں کھرل کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت کرنے والے مجاہدین کے ساتھ مل کر

انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ رائے احمد خاں کھرل کی شہادت کے بعد انگریزوں نے اس جنگ میں حصہ لینے والے دیگر قبائل کی فہرستیں مرتب کرنا شروع کیں تو راجپوت وٹوؤں کی بھی فہرست بنائی اور سرکاری کاغذات میں نہ صرف انہیں باغی لکھا گیا بلکہ جرائم پیشہ بھی قرار دیا گیا۔ اس کے برعکس جن سرداروں نے انگریز حکومت کا ساتھ دیا ان کو خطابات کے علاوہ جاگیریں بھی دی گئیں اور قوم کی بجائے انگریز سے وفاداری کرنے والے یہ جاگیردار آج بھی ہم پر مسلط ہیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ جن وٹو جرائم پیشہ کا کاغذات مال اور حکومت برطانیہ کے پولیس ریکارڈ میں عمل چلا آ رہا تھا تقسیم پاک و ہند کے بعد 1956/57 کے بندوبست کے وقت ان کی ذات سے جرائم پیشہ کا لفظ حذف کر دیا گیا۔ اب یہ خالص راجپوت وٹو لکھے پڑھے جاتے ہیں۔

شیخوشریف کی وجہ تسمیہ اور آمد سادات

بانی شیخوشریف سیّد حسن بخش المعروف حسنین سائیں سلطان پور میں رہائش پزیر تھے۔(۸)

آپ دنیا کی بے ثباتی اور اہل دنیا کے رویوں سے تنگ آ کر پہلے سلطان پور سے لاہور آئے مگر یہاں بھی دستار وسجادگی کے جھگڑے دیکھے تو بددل ہو کر تلاشِ حق اور طلب خداوندی میں ہجرت کر کے دیپالپور آئے اور وہاں سے ستگھرہ پہنچے اور چاہ توتاں والا (موجودہ شیخوشریف) میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔(۹)

آپ پانچویں پشت میں حضرت سیّد عبدالرزاق المعروف شاہ چراغ گیلانی القادری (جن کا روضہ مبارک شارع قائداعظم عقب لاہور ہائی کورٹ واقع ہے) کے پوتے ہیں اور آٹھویں پشت میں حضرت سیّد محمد غوث المعروف بالا پیر امیر قدس اللہ سرہ العزیز (جن کا روضہ نواح ستگھرہ محل وقوع چک نمبر 11/1.R ضلع اوکاڑا میں واقع ہے) کے پوتے ہیں۔

شیخو، شریف بننے سے پہلے 'وجھیرہ' تھا نواب چاوا وجھیرہ کا سپوت۔ اللہ جانے وجھیرہ کوئی نام تھا یا قوم پیشہ، حرفہ تھا یا کوئی خطاب ولقب تاریخی اسناد سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ جب مغل بادشاہ بابر ہندوستان میں در آیا تو اس کے ایک نومسلم حلیف لشکر کے دستہ کا سردار وجھیرہ کہلاتا تھا۔ ہندو تھا کہ سکھ اللہ بہتر جانتا ہے۔ سننے میں یہ آیا ہے کہ وجھیرہ کھرل تھا۔ اور کھرل تو کسی زمانہ میں بہت بڑی شے تھا بلکہ آج بھی اکثر پایا جاتا ہے۔ مشہور یہ کہ کھرل اور سیال ہندو راجپوت بلکہ ''راجواڑے'' تھے۔ یہ بابا فریدالدینؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔ یہ بہت دیر کی بات ہے۔ بابا صاحب کا عہد تو ہندوستان کے مسلمان سلاطین خاندانِ غلاماں، غالباً بلبن کا عہد تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کھرل مخدوم'' صدرالدین عارف'' کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا۔ یہ صاحبؒ حضرت بہاءالحق زکریا ملتانی سہروردیؒ کے فرزندِ ارجمند تھے۔ کچھ بھی ہو بہر حال کھرل اور سیال ہندوستان میں ''احدی'' مسلمان کہلانے کے حقدار ضرور ہیں۔ (۱۰)

ایک عرصہ تک سید حسن بخش المعروف حسنین سائیں شیخو وجھیرہ کی طرف سے ملنے والی رہائش میں رہائش پزیر رہے۔ چاہ توتاں والا میں شیخو وجھیرہ کے علاوہ اس کے کچھ مزارعین اور ہنرمند بھی آباد تھے اس لئے ستگھرہ میں دوسری شادی ہو جانے کے بعد آپ نے علاحدہ رہائش کا ارادہ فرمایا اور نئی سکونت گاہ کے لئے چاہ توتاں والا سے مشرق کی جانب کچھ فاصلے پر واقع چاہ پیپل والا کو پسند فرمایا۔

یہی جگہ آج کے شیخو شریف کا محل وقوع ہے۔ پیپل والے کھوہ (چاہ، کنواں) کو ''بیر والا کھوہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کنواں سید منظور حسین بن سید سردار عالم سائیں کے ڈیرہ میں تھا۔ بعد میں اس کو پاٹ دیا گیا اور یہاں مکانات تعمیر ہو چکے ہیں اس کنوئیں کے شمالی جانب حسنین سائیںؒ نے اپنی رہائش کے لئے ایک احاطہ اور چند سرکنڈوں کے جھونپڑے تعمیر کروائے جنہیں حجرات کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ احاطہ چاردیواری کے اندر والے حجرہ میں آپ کی رہائش تھی اور چاردیواری کے باہر والے چھپّر میں دو ایک

منتخب خادم اور آنے جانے والے مہمان عقیدت مندوں کا عارضی قیام رہتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ جگہ اصحاب صُفہ کی متابعت میں ''صفہ'' کے نام سے مشہور تھی۔ صفہ کے دائیں جانب والا چھپر نماز کے لئے مخصوص تھا بلکہ یہ شیخو شریف کی پہلی مسجد تھی جس کی بنیاد حسنین سائیںؒ نے اپنے دستِ اقدس سے رکھی۔ سرکنڈوں کے یہ دونوں چھپر ایک لحاظ سے تعلیمات قادریہ غوثیہ کی پہلی درس گاہ بھی کہے جاسکتے ہیں کیونکہ فارغ اوقات میں آپؒ آنے والے عقیدت مندوں اور مستقل پاس رہنے والوں کو دعوتِ حق و صداقت اور اسلامی رسم ورواج کی تعلیم دیتے اور تربیت فرماتے تھے۔ آج اسی جگہ ایک شاندار مسجد کی عمارت ہے۔''(۱۱)

اب شیخو شریف کو شہرت مل چکی تھی۔ آپ کے آنے سے یہاں ادب اور ذکر وفکر کی محفلوں کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ میلاد النبی ﷺ کے حوالے سے محافل منعقد ہوتی تھیں اور مریدین کی روحانی تربیت اور تزکیۂ نفس کے لئے ہر ماہ کی گیارھویں پر طالبین حق کا اکٹھ ہوتا تھا۔ اس طریقہ پر یہ سلسلہ جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مشتاق عادل، تاریخِ ساہیوال، ساہیوال: مہکاں پبلشرز، ۲۰۰۹ء، ص ۱۷

۲۔ افضال حسین گیلانی، سیّد، حیات الامیر (جلد دوم)، شیخوشریف: ادارہ صوت ہادی، ۲۰۰۸ء، ص ۷۵

۳۔ مشتاق عادل، تاریخ ساہیوال، ص ۱۷

۴۔ ایضاً، ص ۲۳

۵۔ ایضاً، ص ۱۳۴

۶۔ ایضاً، ص ۱۴۳

۷۔ اللہ دتہ نسیم سلیمی، میاں، تاریخ دیپالپور، لاہور: سنی پبلشرز، ۱۹۹۳ء، ص ۱۶۵

۸۔ افضال حسین گیلانی، سیّد، سوانح حیات سید حسن بخش المعروف حسنین سائیں، شیخو شریف: ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲

۹۔ ایضاً، ص ۳۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۷۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۹۷

باب دوم

خاندان مراتب اور ادب

خاندان مراتب اور ادب

سیّد مراتب علی اختر کے اجداد سے لے کر اب تک گیلانی سادات ادب کے پودے کی آبیاری میں مصروف ہیں۔ یوں تو تصوف اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے اہل تصوف کا ادب شناس اور صاحب ذوق ہونا لازمی امر ہے مگر اس خاندان کی ہستیاں جنھوں نے خود شعر کہے ان کا ذکر کچھ یوں ہے۔

حضرت شیخ غوث محمد اُچی

آپ سادات شیخو کے جدّ امجد ہیں آپ صاحبِ دیوان شاعر تھے اور آپ کا دیوان ''دیوانِ قادری'' کے نام سے موجود ہے۔(۱) پروفیسر ڈاکٹر محمد جمیل قلندر اس پر تحقیق کر رہے ہیں۔ آپ مشاہیر و اکابر سادات حسنی ہیں حضرت غوثِ اعظمؒ سے نسبت آبائی ہے۔ صاحبِ عظمت و کرامت، واقفِ منقول و معقول تھے۔ عبادت و ریاضت اور زہد و ورع میں یکتائے روزگار تھے۔

> سیّد اصغر علی گیلانی صاحب شجرۃ الانوار رقم طراز ہیں کہ سیّد محمد کے بزرگوں میں سے اوّل سید ابوالعباس بن سید صفی الدین سید عبدالقادر جیلانیؒ اپنے چھوٹے بھائی سید ابو سلیمان کے ساتھ 656 ہجری میں ہلاکو خاں تاتاری کے حملہ بغداد اور قتل و غارت کے وقت بغداد سے نکل کر روم آ گئے۔ پھر جب کچھ امن و امان ہوا تو حلب میں آ کر اقامت گزین ہو گئے۔ سید محمد غوث یہیں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت اپنے والد سے

حاصل کی۔عنفوان شباب میں پدر بزرگوار کی اجازت سے مختلف ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت کو نکلے، حرمین الشریفین کی حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔عراق، عرب، ایران، خراسان، ترکستان اور سندھ و ہند کی طویل سیاحت کی۔ یہاں کے اکابر علماء وفضلا اور مشائخ وصوفیا سے ملاقاتیں کیں۔ لاہور بھی تشریف لائے۔ چندے یہاں قیام کیا پھر ناگور چلے گئے۔ یہاں ایک مسجد تعمیر کی۔غرض اسی طرح سیر و سیاحت کرتے ہوئے واپس حلب پہنچے اور والد گرامی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک دن دوران گفتگو عرض کی کہ فقیر کا دل یہ چاہتا ہے کہ اقلیم ہند میں کسی جگہ سکونت اختیار کرلوں۔حضرت کا کیا ارشاد ہے؟ انہوں نے فرمایا۔''میں چراغِ سحری ہوں، کچھ توقف کرو، میری وفات کے بعد تمہیں اختیار ہوگا جہاں جی چاہے رہنا۔پس آپ اپنے والد سید شمس الدین بن سید شاہ میر بغدادی گیلانی کی وفات کے بعد براستہ خراسان ملتان آئے اور اُچ کے مقام پر سکونت اختیار کی۔صاحبِ شجرۃ الانوار نے آپ کا ورودِ اچ 887 ہجری لکھا ہے۔اس وقت شاہ حسین لنگاہ متوفی 908ھ حاکم ملتان وسندھ سکندر لودھی متوفی 923ھ بادشاہِ ہند تھا۔دونوں آپ کے حلقہ ارادت میں داخل تھے۔آپ کے وجودِ مسعود سے سلسلہ قادریہ ہندوستان میں پھیلا۔ (۲)

آپ نہ صرف شعر و شاعری سے محبت کرتے تھے بلکہ خود بھی شاعر تھے۔آپ قادری تخلص کرتے تھے اور اکثر شاعری حضرت شیخ عبدالقادر کی منقبت کی صورت میں کی۔مولانا عبدالرحمٰن جامی صاحبِ نفحات الانس نے آپ کے فضائل کی خبر پا کر اپنے کچھ اشعار آپ کی خدمت میں بھیجے۔ روایات کے مطابق حاکم ملتان شاہ حسین لنگاہ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت غوثِ اعظم کہہ رہے ہیں کہ اپنی بیٹی کا نکاح میرے فرزند سید محمد سے کردے لہٰذا اس نے ایسا کردیا مگر اس بی بی کے بطن سے حضرت سید محمد کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد سید ابوالفتح حسینی جن کی آبائی نسبت چار واسطوں سے سید صفی الدین بانیِ اچ جو کہ سید ابواسحاق گازرونی المعروف بہ میراں بادشاہ لاہوری کے ہمشیرہ زاد تھے تک پہنچتی ہے۔آپ نے ان کی دختر سے شادی کی جن کے بطن سے چار لڑکے پیدا

ہوئے۔جن میں بزرگ ترین سید عبدالقادر ثانی دوم عبداللہ ربانی سوم مبارک حقانی چہارم سید محمد نورانی تھے۔موخرالذکر لاولد فوت ہوئے۔سید ابوالفتح جو بانی اُچ کی اولاد میں سے تھے انہوں نے اچ کی متعلقہ زمین اپنی چار لڑکیوں میں تقسیم کر دی تھی۔نیز آبادی اُچ گیلانیاں اُچ بخاریاں سے الگ، یہ حصہ زمین وہ ہے جو سیدہ فاطمہ زوجہ محترمہ حضرت سید محمد غوث کے حصہ میں آئی تھی۔دیوانِ قادری میں شامل آپ کی ایک غزل کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

دلِ آشفتہ می گوید حدیثِ زُلف جاناں را
کہ تا مجموع گرداند ازیں جمع پریشان را
ہوای کُنونِ میخانہ کنون گر می زندراہم
مقامِ اصلی است آری مدام آن اہل عرفان را
اگر خواہی کہ کفر و دین بیکدم می زنی برہم
زند بہ ارغوان چوگان ، بگوآن نامسلمان را
دہانش با شکر گفتم ، لبش عُناب گفتامن
حدیث بس شُگرف است ، این چگونی کوی مرجان را
مرا در قلزم حیرت نہنگِ عشق شد گشتی
مقیمِ عالمِ وحدت چہ داند ساز و سامان را؟
ہمہ عالم پر از عشق است و ہر سو طور با موسی
چو خضر از جانب ظلمت برآور آبِ حیوان را
ہلا اے قادری کردند عقل ونقل از حکمت
کمال از عشق می باید بحمد اللہ مردان را(۳)

مخدوم عبدالقادر ثانیؒ اُچوی

آپ شیخ محمد غوث کے فرزندِ ارجمند ہیں اور شیخ عبدالقادر ثانی کے لقب سے مشہور تھے۔ آپ ظاہری و باطنی کرامات، عمدہ اوصاف اور کمالات کے مالک تھے۔ اکثر غیر مسلم آپ کے مشاہدہ جمال اور معائنہ کمال کے سبب توبہ کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپ اچ شریف میں حضرت غوث الثقلین کے حقیقی وارث اور کمال میں انہیں کے تابع ہیں اسی لیے آپ کو شیخ عبدالقادر ثانی کہا جاتا ہے۔

حکایت ہے کہ آپ نے اپنی نوجوانی نہایت ہی ناز ونعم اور آسودگی میں بسر کی۔ آپ عیش ونشاط کے اتنے دلدادہ تھے کہ گانے بجانے کی کئی چیزیں اونٹوں پر لاد کر آپ کے ساتھ جاتی تھیں۔ لیکن سجادہ مشیخیت اور مقام تربیت وہدایت پر نشست کے بعد ہر قسم کے گانے بجانے اور قوالی سے بھی پرہیز کرنے لگے۔ اور اپنے مریدوں معتقدوں اور طلب گاروں کو بھی قوالی وغیرہ سننے سے نہایت سختی سے منع کرتے تھے۔ اگر اچانک قوالی وغیرہ کا کوئی بول آپ کے کان میں پڑ جاتا تو بارگاہِ الٰہی میں اتنی گریہ زاری کرتے کے جان نکلنے کے قریب ہو جاتی۔ آپ پر حالتِ جذب کی ابتدا کا واقعہ اس طرح ہے کہ ایک دن اُچ کے جنگل میں شکار کھیل رہے تھے کہ ایک تیتر عجیب وغریب آواز میں نالہ وفریاد کر رہا تھا۔ ایک درویش بھی جنگل میں گھوم رہا تھا اس نے تیتر کی آواز سن کر آپ کو دیکھ کر کہا۔ ''سبحان اللہ''۔ ایک دن آئے گا کہ یہ نوجوان بھی اس تیتر کی طرح نالہ وفریاد کرے گا۔ درویش کی بات آپ پر خاص اثر کر گئی۔ ان پر ایک خاص حالت طاری ہوگئی۔ غیر اللہ سے دل ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھر اس کے بعد روزانہ ان پر جذب کے اسباب، شوق کے آثار اور محبت الٰہی کے انوار کی مسلسل بارش ہونے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ غیر اللہ سے تعلق چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے ہو گئے۔

ایک حکایت یہ ہے کہ آپ کے والد کے پاس کہیں سے مخمل کے تھان آئے انہوں نے آپ کے پاس یہ کہہ کر بھجوائے کہ ان سے اپنا لباس بنوالو۔ لیکن آپ نے اس کپڑے سے اپنے شکاری کتوں کے لئے جھولیں سلوالیں۔ اس واقعہ کی اطلاع جب

آپ کے والد بزرگوار کو ہوئی تو انہوں نے آپ کو بلوا کر ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اسی رات آپ کے والد گرامی نے خواب میں حضرت غوث اعظم کو فرماتے ہوئے سنا کہ تم اپنے دوسرے بیٹوں کی دیکھ بھال کرو۔ عبدالقادر ہمارا بیٹا ہے اس کی تربیت ہمارے ذمہ ہے۔ اس واقعہ کے ساتھ ہی آپ پر جذب وحال کی فروانی ہوگئی۔ توبہ کر کے تمام عیش ونشاط ولذت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ گانے بجانے کے آلات توڑ دیئے شکاری جانور چھوڑ دیئے سر منڈا سلوک کی راہ لی۔ آپ کے والد ماجد نے اپنی حیات میں ہی سب بھائیوں کے سامنے صاحب سجادہ مقرر کر دیا۔ آپ کے دوسرے بھائی بادشاہ وقت کے ملازم خاص تھے۔ آپ بہت عرصہ پہلے بادشاہ کی طرف سے مقرر کردہ مسندِ شیخ الاسلام کو چھوڑ چکے تھے۔ والد ماجد کی وفات کے بعد بادشاہ نے باوجود اندرونی کدورت کے آپ کو سجادہ نشینی اور دیگر امور کے تمام کاغذات اور مناسب وظیفے کی بحالی کا نیا فرمان جاری کر دیا اور اپنے خاص چوبداروں کے ذریعے آپ کے پاس بھیجا لیکن آپ نے جواب دیا کہ ہمیں کسی چیز کی حاجت نہیں رہی بادشاہ کی مرضی ہے جسے چاہے یہ سب کچھ دے دے۔ غرضیکہ بادشاہ کے غیظ وغضب اور دشمنوں کے ہاتھوں پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر کیا اور پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ آئی۔ بادشاہ کی طرف سے معذرت اور مصالحت کے فرمان کے جواب میں حضرت مخدوم ثانی نے یہ اشعار لکھ کر بھیج دیئے۔

به ہیچ باب ازیں باب روئے گشتن نیست
ہر آنچہ برسرِ ما میرود مبارک باد
کسے کہ خلعت ِ سلطانِ عشق پوشید است
بحلّہ ہائے بہشتی کجا شود دل شاد (۴)

امام حیدر بخشؒ

امام حیدر بخش مراتب اختر کے اجداد میں ایک بزرگ اور صاحب طرز شاعر ہوئے ہیں۔ نہ صرف شاعر تھے بلکہ پاک و ہند میں سلسلہ عالیہ قادریہ کے ایک عظیم شیخ و مرشد تھے۔ آپ نے ظاہری تعلیم اپنے والد اور دوسرے بڑے علماء وقت سے حاصل کی۔ آپ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ (۵) آپ روحانی پیاس بجھانے کے لئے لاہور تشریف لائے اور چچا سیّد مجتبٰے کے دستِ اقدس پر

بیعت کی کچھ وقت ان کی خدمت میں رہے اور اصلاح قلب کے بعد واپس سلطان پور چلے گئے۔ وہیں آپ کا وصال ہوا اور آپ کا مزار شریف بھی وہیں ہے۔ وسطی پنجاب کی اکثر سلسلہ قادریہ گیلانیہ کی بیعت کا سلسلہ آپ تک پہنچتا ہے۔ آپ صاحبِ دیوان شاعر تھے مگر آپ کا دیوان سکھا شاہی کے دوران ضائع ہو گیا تھا۔ ''سیّد حیدر شاہ بخش المشہو رحیدر شاہ فقیری بودندہ بوس و دیوان در نظم دارند بعہد تسلط سکھان بر لاہور''(۶) آپ کے اشعار زبان زدِ عام و خاص ہیں۔

الف۔ اللہ کو ایک کر مانو

ب۔ با نوا کوئی اور نہ جانو

ت۔ ترک سبھی سے کریے

ث۔ ثابت کر پاؤں دھریے

ج۔ جلال اسی سے ڈریے

ح۔ حرام کی ڈھونڈ نہ کریے

سیّد حسن بخش المعروف حسنین سائیںؒ

بانی شیخو شریف سید حسن بخش المعروف حسنین سائیں ایک معروف شاعر اور ولی کامل تھے۔ آپ کا خاندانی اور والدین کی طرف سے تجویز کیا گیا نام ''سید حسن بخش'' تھا۔ ''حسنین سائیں'' کے

لقب سے مشہور خلائق ہوئے۔آپ کے عقیدت مندوں میں ہندو سکھ اور دیگر غیر مسلم قبائل بھی کثرت سے شامل تھے جو آپ کے اس لقب کے اوّل میں ایک ''سابقہ'' کا اضافہ کر کے آپ کو ''داتا حسنین سائیں'' پکارتے تھے۔

حسنین سائیں اپنے سے زیادہ دوسروں کی ضرورت کا خیال رکھتے تھے۔جو چیز ہاتھ آتی وہ دوسرے حاجت مندوں میں تقسیم فرما دیتے۔اسی لئے خلق خدا کی زبان پر ''داتا حسنین سائیں'' جاری ہوگیا۔اور آج تک یہی عرفِ عام وخاص ہے۔یہی صفت اہلِ بیت رسول ﷺ کا نشانِ امتیازی ہے۔

آپ کے فارسی زبان میں منظّم شجرہ میں سے حمد ونعت کے اشعار کا نمونہ یہ ہے۔

حمد

حمد گوئیم بے قیاس از جان و دل
آنکہ پیدا کرد آدم راز گل
خلقت ہژدہ ہزار عالم نمود
از عدم بخشید تشریفِ وجود
خاکی را از خلائق برگزید
رُوحِ خود در قالب او را دمید
در حقِ انساں چنیں گفتہ خدا
سِرِّ اومائیم واو شد سرِّ ما(۷)

نعت

اشرفِ انساں محمد احمد است
ہر دو عالم مست جام از او شد است

رحمت للعالمین فرمود ، حق
برسر آدم ازاں دارو سبق
از طفیلش انبیاء و اولیاء
یافتہ راہ در حریم کبریا
اے خدا! بفرست تو صلوٰۃ را
بردے و بر آل پاک با صفا(۸)

سیّد سید محمد گیلانیؒ

خاندانِ سادات شیخو شریف میں سیّد سید محمد ولی کامل ہوگزرے ہیں۔آپ کو شاعری کا خاصہ ملکہ تھا۔مگر باقاعدہ صنف کے طور پر نہیں اپنایا۔آپ کی ولادت عروجِ ماہ ذوالحجہ 1180ھ بمطابق 1769ء میں حضرت بی بی خاتونؒ بنت سید غلام مرتضےٰ گیلانی کے بطن اطہر سے ہوئی۔ ''حیات سید محمد گیلانی'' میں ہے کہ آپ کے والد داتا حسنینؒ فرماتے ہیں کہ میرے فرزند سیّد سید محمد کی پیدائش سے قبل ہی مجھے رویائے صادقہ کے ذریعے بشارتیں ملنی شروع ہوگئیں۔فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت بالا پیرامیرؒ کے مزار پر معتکف تھا۔اور اعتکاف کے آخری دنوں میں ایک رات میں نے دیکھا کہ حضور بالا پیرامیرؒ کے مزار کی پائینتی کی جانب جوون کا درخت ہے اس کی پتیاں اچانک روشن ہو گئیں ہیں۔درخت کی شاخیں مجھ پر جھکتی آرہی ہیں۔اسی وقت عالم مراقبہ میں حضرت بالا پیرؒ نے مجھ سے فرمایا۔''ابو محمد عنقریب تمہاری سیادت میں ترقی ہوگی۔'' داتا حسنین فرماتے ہیں قبل ازیں مجھے اس نام سے کسی نے نہیں پکارا تھا۔میری اہلیہ ان دنوں امید سے تھی۔مجھے یقین ہوگیا کہ باری

تعالیٰ مجھے فرزند عطا فرماوے گا اور میں اس کا نام محمد ہی رکھوں گا۔ سید حسنین سائیں فرماتے ہیں کہ اکثر چلتے ہوئے یا تنہائی میں بیٹھے ہوئے میرے کان میں غیبی آواز آتی۔ ''حسن بخش تمہیں پاکیزگی نسب و نسل مبارک ہو۔'' اور میرے دل کو انجانی سی خوشی محسوس ہوئی۔

آپ کی والدہ ماجدہ بیان فرماتی ہیں کہ سید محمد سے پہلے میرے دو بچے ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوئے لیکن آپ کی بار دوران حمل مجھے جس قدر بشارتیں اور خواب میں بزرگوں کی زیارتیں ہوئیں پہلے نہ ہوئی تھیں۔ چنانچہ ایک بار میں نے خواب میں آنحضرت رسول مقبول ﷺ اور حضرت علیؓ کو دیکھا کہ حضرت علیؓ کے ہاتھوں میں سرخ رنگ کے کپڑے میں لپٹا ہوا ایک نوزائیدہ بچہ ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''علی یہ بچہ اس کو دو'' میں نے وہ بچہ مولا علیؓ کے دستِ مبارک سے گود میں لے لیا۔ دیکھا کہ بچہ کچھ نحیف اور بیمار ہے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ تو بیمار ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا۔ ''علی اس پر ہاتھ پھیرو'' چنانچہ مولا علیؓ نے مجھ سے بچہ لے کر اس پر ہاتھ پھیرا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے بچے کے چہرہ کو دونوں ہاتھوں میں لے کر لعاب دہن لگایا۔ اور فرمایا ''بیٹی یہ بچہ میرا ہے۔ اب یہ کبھی بیمار نہ ہوگا۔'' جناب بی بی خاتون فرماتی ہیں کہ جب آپ پیدا ہوئے تو واقعی آپ نحیف اور کمزور تھے مگر ایام شیر خوارگی میں ہی آہستہ آہستہ تندرست ہو گئے۔ (۹)

آپ عربی اور فارسی علوم پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی شاعری ایک منظوم بدعا کی صورت میں ملاحظہ ہو جو آپ نے سمیلی نامی شخص کو دی جس نے چوری کا بھینسا آپ کے کہنے پر واپس نہ کیا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا سمیلی توں نے میری بات نہیں مانی تمہیں

پرسوں تک پتہ چل جائے گا۔

چھڈ جا سمیلی جھگیاں
ککڑ تیرے بلیاں کھادے
خالی ہوگیاں کھڈیاں
رَن تیری دی مجھلی پاٹی
ٹاکیاں لاوے بھگیاں
چھڈ جا سمیلی جھگیاں (۱۰)

ابھی تیسرا دن نہ گزرا تھا کہ احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان شاہ قابلی کے ایک آوارہ گرد لشکر نے موضع سمیلی ساہوکا پر ہلّہ بول دیا اور اس قدر قتل عام کیا کہ گلیاں لاشوں سے بھر گئیں۔ خود سمیلی بھی مارا گیا۔ جو لوگ بچ گئے انہوں نے بھاگ کر جان بچائی۔ کہتے ہیں کہ وہ گاؤں تو اسی نام سے موجود ہے مگر ساہوکا قوم بالکل نیست و نابود ہو چکی ہے۔

ناصر شہزاد

سادات شیخوشریف میں ایک اہم نام سید ناصر شہزاد کا ہے جو 19 دسمبر 1937ء کو شیخوشریف میں پیدا ہوئے اور 22 دسمبر 2007 کو 70 سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ (۱۱) ناصر شہزاد جو مراتب اختر کے ماموں زاد اور پھوپھی زاد تھے ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''چاندنی کی پتیاں'' 1964 میں چھپا۔ 40 برس بعد 2004 میں دوسرا شعری مجموعہ ''بن باس'' چھپ کر سامنے آیا۔ ان کا تیسرا شعری مجموعہ ''پکارتی رہی بنسی'' ۲۰۰۸ء میں چھپا۔ ناصر شہزاد کی نثری تخلیقات میں ''کون دیس گیو'' (حیات مجید امجد) کے علاوہ خطوط پر مشتمل نسخہ ''خط لکھیں گے'' اور دیباچوں کا مجموعہ ''ناصر شہزاد کے دیباچے'' قابل ذکر ہیں۔ ناصر شہزاد کی شاعری کے بارے مجید امجد یوں کہتے ہیں:

جب اس نے قلم اُٹھایا اس زمانے میں بہت پہلے سے اردو غزل ایک بنے بنائے کلیے

کے تابع تھی جہاں جہاں اوروں نے اس کے تسلیم شدہ موضوعات کو رد کر کے نئے تصورات کے بیان کے لئے نئے رنگ اور نئے زاویے ڈھونڈے وہاں ناصر شہزاد نے پرانے قصوں ،لوک گیتوں اور صحیفوں کی روایت کو غزل کے پیرائے میں بیان کیا جو رُوحوں کے نہاں ترین گوشوں میں سدا جھلکتی رہی ہے لیکن سوچوں اور نظروں کی دنیا سے دور تر تھی۔اس کا یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ یہ تجربہ اپنے ساتھ نئے الفاظ لایا۔ایسے الفاظ اور ایسی ترکیبیں جو اس سے پہلے غزل میں کبھی استعمال نہیں ہوئی تھیں۔اس نے الفاظ کی ان منظور شدہ فہرستوں کو یکسر منسوخ کر دیا جن کے بغیر کوئی غزل ذی تغزل شمار نہیں ہو سکتی تھی۔اب یہاں نئی بستیاں، نئے لوگ، نئے نام کے پھول، نئے نئے نام کے پرند، ایک نیا موسم اور ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔اس دنیا سے مختلف جو اس سے پہلے کی غزل میں منقوش نظر آتی ہے۔ یہ لوگ، یہ چہرے، یہ بن، یہ پھول، یہ بستیاں اس ان دیکھی میراث کا حصہ ہیں جو ہر انسان کے ذہن کی آغوش میں ہے۔ اسی کی تاثیر انگیزی سے اس مسرت کے سراغ ملتے ہیں جو ہماری ثقافت کا بھولا ہوا نام ہے، یہاں نئی بستیاں، نئے لوگ اس لحاظ سے نئے ہیں کہ وہ اب معرض وجود میں آئے ہیں بلکہ وہ اس لحاظ سے نئے نہیں۔اس سے پہلے اردو غزل کے اندر ان کے ذکر کو جگہ نہیں ملتی تھی۔درحقیقت یہ لفظ، یہ نام، یہ شبد، بہت پرانے ہیں۔ پرانے پنجابی گیتوں ،فراموش شدہ ہندی دوہوں، پرانی بھاشاؤں میں انہی کا جادو ہے۔ یہ لفظ اردو غزل میں نئے ہوں تو ہوں لیکن پنجاب، سندھ، ملتان، بنگال اور دوسرے علاقوں کی بولیوں میں زمانوں سے رائج ہیں۔اس جادو کو جگانے کے لئے شاعر کی ذہنی کاوش ایک ادق عمل ہے۔اس دنیا اور اس کی تڑپتی ہوئی حقیقتوں کے دھارے پر بہتے ہوئے اس نے اس سب کچھ کو جو اس کے سامنے ہے پرانے قصوں اور روایتوں کی شکل میں دیکھا پھر اسی شکل کو اسی ہیولے کو شعروں میں منتقل کر دیا ہے۔لوہے، سیمنٹ، بجری، کولتار سے ڈھلی ہوئی صداقتوں سے ظہور میں آنے والی پیچیدگیوں کی دنیا میں اس نے اس احساس کی ترجمانی کی جسے وقت کا تیشہ نہیں کاٹ سکتا۔اس کی یہ غزلیں سچی محبت کے گیت ہیں ،مکھڑوں اور نینوں کی مدحیں ہیں۔ پگڈنڈیوں اور پنگھٹوں کی

کتھائیں ہیں۔ بادلوں اور پروائیوں کی کوتائیں ہیں۔ ان کے آہنگ کی سب سے نازک اور جذبیلی سطح وہ ہے جہاں پر پریتم کی یاد میں آنسو بہانے والی سجنیوں اور سکھیوں کی کہانی آتی ہے۔ (۱۲)

پروفیسر ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے ان الفاظ میں ناصر شہزاد کی شاعری کو سراہا ہے:

ناصر شہزاد کی شاعری میں لفظ زندہ تجربہ بن کر آتا ہے۔ ہر لفظ اپنی جگہ ایک فرد بھی ہے اور ایک قبیلہ بھی اور یہی وہ خصوصیت ہے جو اُس کو اُس کے معاصرین سے بالخصوص اور دیگر شعراء سے بالعموم مختلف کرتی ہے۔ میں اپنے شعری نظریات میں بڑا سخت آدمی ہوں اور بن بلائے مہمان کی حیثیت سے لفظوں کو کاغذ پر اُتارنا گناہ سمجھتا ہوں۔ ناصر شہزاد کی شخصیت میں مجھے ایک ہی بات پسند ہے اور وہ ہے نفی ذات اور منکسر مزاجی۔ یہی میرے نزدیک تخلیقی فنکار یا تخلیقی لگن رکھنے والے شخص کی نشانی ہے۔ ناصر شہزاد کے ساتھ یہ بات بھی خاص ہے کہ وہ روحانی سرچشمے جس سے اس نے تحریک شعر حاصل کی ہے۔ اُن کا شجرہ بزرگوں اور دوستوں کی فیض صحبت سے ملتا ہے۔ (۱۳)

ناصر شہزاد کے گیتوں کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر آلِ احمد سرور کی رائے یوں ہے:

گیت میں پہلا نام بھی شہزاد کا ہے اور آخری بھی۔ (۱۴)

ناصر شہزاد کے چند اشعار درج ذیل ہیں جن سے ان کے ادبی مقام و مرتبے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حمد

جڑے تجھی سے سرا سری داستانوں کا
تو بادشاہ ہے زمینوں کا آسمانوں کا
کنارِ نہر پہ یہ سرکنڈوں کی اونچی قطار
کہ جیسے دوار کھلا ہو نگار خانوں کا

گلاب زاروں میں پنچھی کریں تری توصیف
تو راہ گزاروں میں ساتھی ہے ساربانوں کا
ابھی سمے سے کہو راہ پر جمے نہ تھمے
ہے منتظر ابھی دریا جہاز رانوں کا
پنپ رہا ہے پپیہے کی نرم ''پی ہو'' سے
صدی کے تٹ سے پھسلتا سفر زمانوں کا

نعت

رنگ مانندِ سحر ، پھول سا چہرہ ہو گا
سوچتا رہتا ہوں میں تجھ کو تو کیسا ہو گا
درشنا تیرے کئی ورشنا دل کی خاطر
دل پپیہے کی طرح پیاسا نراسا ہو گا
دیں کا آئین محمدؐ ہیں تو تزئین حسین
ایسا نانا نہ کوئی ایسا نواسا ہو گا
لوحِ محفوظ ترے نام کی نکہت سے نہال
پستکِ علم پہ تو۔۔۔ تیرا اُجالا ہو گا
دھیان میں بکھرے چٹانوں سے اذانوں کی صدا
دل نے سینے میں رکھا شہرِ مدینہ ہو گا

اورغزل کے شعر دیکھیے:

دیکھوں تجھے تو روح کا صحرا سلگ اُٹھے
چاہوں تجھے تو تیری لگن میں مٹھاس ہے

آ کے اس بن میں کبھی پھر نہ ملے دو پریمی
گھاس پگڈنڈیوں سے جھیل سے کاٹی نہ گئی

یاد آیا روح کو تجھ سے بچھڑنے کا وہ پل
پھول کل ایک شاخ پر جب کھل کے مرجھانے لگا

زندگی جب بھی کسی شئے کی طلب کرتی ہے
میرے ہونٹوں پہ تیرا نام مچل جاتا ہے

ناصر شہزاد نے کئی گیت بھی لکھے۔ ناصر شہزاد کے گیت کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

لاگی نگر میں ساونی
آری سکھی من بھاونی
لاگی نگر میں ساونی
گرج برج کر بدرا چھایا
ناچا مور پپیہا گایا
رت ساون سہانی
آری سکھی من بھاونی

یونہی بتائے سارے زمانے
پاٹے مدھو بن ،جھنگ مگھیانے
ڈال کہیں اب چھاؤنی
آری سکھی من بھاونی

سیّد افضال حسین گیلانی

سیّد افضال حسین گیلانی مراتب علی اختر کے چھوٹے بھائی ہیں۔ 12 اکتوبر 1942 کو پیدا ہونے والے سیّد افضال حسین گیلانی پنجابی، اردو، عربی اور فارسی زبان پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ان کے شعری مجموعے ''وناں دی چھاں تے سسّی''، ''بدلے رنگ دھریکاں'' تے ''آہیں+ آڑنگ= آہر'' چھپ چکے ہیں جبکہ آپ کی نثری تخلیقات میں ''حیات الامیر'' جلد اوّل، دوم، حیات سیّد سید محمد سائیں اور حیات حسنین سائیں'' قابل ذکر ہیں۔ان کا کلام ماہِ نو، پنجابی ادب، لہراں، مہکاں اور وروے میں چھپ چکا ہے۔اپنی شاعری کے بارے میں سیّد افضال حسین گیلانی کہتے ہیں:

> میں اپنے کلام بارے نہ کجھ آپ آکھنا چاہندا واں تے نہ ہی اپنے لگدیاں توں سننا چاہندا ہاں۔ایہہ سارا کم جانواں، بیگانیاں تے دوجیاں لئی چھڈ دِتا ہے۔اہل دل تے سخن شناس میرے سخناں دی آپ صرافی کر لین گے۔حسن دی خوبی تاں اوہ اے جہندی سوکن تعریف کرے۔اپنے موہوں میاں مٹھو بنن دی کی لوڑ اے۔ (۱۵)

سیّد افضال حسین گیلانی کی شاعری کے حوالے سے اُن کی کتاب ''وناں دی چھاں تے سسّی''، میں شامل ایک مضمون میں سیّد علی ثانی، ان کی شاعری کو سراہتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> خیال کی نظامت کے ساتھ ساتھ الفاظ کے نظامت اور تراکیب کی بندش اور نزاکت

کمال درجہ کی ہے اور پھر خاص بات یہ ہے کہ جو زبان اس شاعری میں استعمال کی گئی ہے اور کوئی سرکاری درباری نہیں یہ وہ پنجابی نہیں جو لکھی اور پڑھی پڑھائی جاتی ہے اور جس کا تعارف آج کے پنجابی ادب میں کرایا جاتا ہے بلکہ یہ وہ پنجابی ہے جو خالصتاً بولی جاتی ہے۔ اگر چہ اس میں تمام علاقوں کی زبان دانی کا رنگ ہے مگر اس میں ضلع ساہیوال سے لے کر جھنگ کے علاقہ کا اثر خاص طور پر غالب ہے۔ اور اعلیٰ شاعری کا خاصہ یہی ہوتا ہے کہ اس کا لب ولہجہ کتاب کی بجائے کلام سے زیادہ مناسبت رکھتا ہو۔ (۱۶)

معروف شاعر ناصر شہزاد نے ان کی کتاب ''کافی اے یار داویہڑہ'' میں افضال حسین گیلانی کے بارے میں لکھا ہے:

جب کسی کو اپنا دین اور ایمان بنا لیا جائے تو ایقان وعرفان کی منزل قریب تر ہو جاتی ہے۔ افضال گیلانی نے بالا پیر کے دربار سے اپنے لئے جاودانی قصے کرتار کئے ہیں۔ جن کی چھتکار اُن کے جیون کے اُن ماہ سالوں کو اپنے محیط میں لئے ہوئے ہے۔ جن کے بسیط ان کی جوانی کے لئیق دنوں تک چلے گئے ہیں۔ بالا پیر کے دربار کے سامنے شمالی سمت کی طرف انہوں نے اپنے بنوائے ہوئے حجرہ میں بیٹھ کر دن رات بالا پیر کو سوچا اور لوچا ہے۔ دن رات ان کے دھیان کو اپنے من کے شبستان سے گزرا ہے۔ ان کے بیت دوہے اور کافیاں کہی ہیں۔۔ جو صرف کافیاں ہی نہیں بلکہ پنجابی زبان میں تیز تنک اور خواب خُنک موشگافیوں کے ساتھ ساتھ انگیں شعروں کی قندیلیں بھی ہیں اور تاویلیں بھی:

دیگر ویلا اے ، وقت کویلا اے
نیڑے شاماں۔۔۔چارے لاہماں
نظراں ماراں میں وَ واٹ نہاراں میں

پیار ترے دا پیا ساہاں میں بھر کے دیویں کاسہ (۱۷)

سیّد افضال حسین کی کافیوں کے چند نمونے:

میریا سچیا مالکا! مینوں تیرا آسرا

تیرے بِنا کسے کول نہ میرے درداں دا دوا

مرشد توں رب نما مینوں تیرا آسرا!

جدوی زمانے دل نوں دکھایا تیرے پیار نے آن بچایا

واہ واہ لجپایاں توں نبھائیاں میریا سچیا مالکا۔۔۔

تینوں شرماں میریا سائیاں میرے کول نہ کجھ چنگیائیاں

للہ بخشو جو پیاں خطائیاں میریا سچیا مالکا۔۔۔۔

☆☆☆

محمد دا جانی غوثِ جیلانی ایہہ نبیاں دی بن کے ہے تصویر آیا
کفر دے ہنیرے تے شرکاں دے گھیرے دے وچ پھڑ کے حیدر دی شمیر آیا
ایہہ سب غوث پیاسے نے تیرے کرم دے
پئے تینوں جھکدے شہنشاہ عجم دے
نبوت رسالت امامت ولایت تے قرآن دی بن کے تفسیر آیا
تیری شان اعلیٰ، تیرا نام بالا
تیرے در دا ذرّہ ہے چن توں نرالا
ایہہ چن تارے، سورج نے تیرے سوالی ہر اک تیتھوں ہی لے کے تنویر آیا

☆☆☆

سیّد افضال گیلانی کی داستانِ سسی پنجابی دوہڑوں کی صورت موجود ہے اور خصوصاً دیوڑھ بند کے

حوالہ سے آپ بے مثل شاعر سمجھے جاتے ہیں:

نکیر قبر وچہ آن کے پچھدن ، دس کون تیرا کی ناں اے ۔ کہڑی تھاں اے
تیرا رب رسول تے دین کہڑا ، دس پورا پتہ نشاں اے ۔ نال نہاؤں اے
میں قاصد ہاں رب تیرے دا ، میں گھِننا ں حلف بیاں اے ۔ جانا تاں اے
افضاؔل سسی ہتھ بنھ کے اُٹھی ، توڑے آیا پنل خاں اے ۔ ٹھارن ہاں اے

نازک پیر ملوک سسی دے ، جنہاں بھار حنا نہ چائے ۔ تھل وچہ آئے
حُسن تے جوبن دے پھل کلیاں ، گئے لُو دے وچہ کُر مائے ۔ گئے مرجھائے
کدیں تھک کے باندھی کدیں کوک کے اٹھدی کدی تُردی پیر لنگا اے ۔ آبلہ پا اے
افضاؔل شہادت بند بند دیسی ، جیویں سسی وقت لنگھائے ۔ جو سر آئے

کامل عشق سسی دا یارو ، ودی تھل و چ بھان بھلیندی ۔ کھوج مریندی
عقل خردکوں چھوڑ دتو سوں ، پئی عشق کوں توڑ چڑھیندی ۔ پریت نبھیندی
ہک ہک کھوج سمجھے کعبہ ، پئی ادبوں طواف کریندی ۔ نفل ثِنیندی
ویکھ ایمان افضاؔل سسی دا ، وَدی شتر دے کھوج چمیندی ۔ سجدے ڈیندی

نہ پو اس کھاڑے نی سسیے اس عشق دے راہ نی پٹھڑے ۔ کئی گئے مُٹھڑے
اس راہ دے وچہ ہن خار ہزاراں کئی گئے ہن راہ وچہ کُٹھڑے ۔ راہ تو گھتھڑے
بھل ذات صفاتاں عشق دے راہ وچہ ہٹ بیٹھے تے نہ اُٹھڑے ۔ سوہنے مکھڑے
افضاؔل وانگوں آباد رہے ہن دردوں ڈھن اپُٹھڑے ۔ جان تے رٹھڑے

سیّد سید علی ثانی گیلانی

سیّد سید علی ثانی مراتب اختر کے بھتیجے اور سید افضال حسین گیلانی کے فرزند ارجمند ہیں اورادب کے پودے کی آبیاری میں مصروف ہیں۔سید علی ثانی نے مراتب اختر کی سوانح حیات ''حسبِ مراتب'' کے نام سے لکھی ہے جو 2006 میں چھپی۔تصوف کے بنیادی عوامل پر آپ کی تصنیف 2003 میں آئی۔سید موسیٰ پاک شہید کی کتاب ہدایت المریدین کا حاشیہ بھی سید علی گیلانی کی ادیبانہ کاوشوں کا مظہر ہے۔سید غوث عبدالقادر جیلانی کی سیرت وسوانح حیات ''انیس المظاہر فی سیرت سید عبدالقادر'' کی تحقیق وتعلیق سیّد سید علی گیلانی کی بہترین ادبی کاوش کی صورت میں 2011ء میں سامنے آئی جو اس وقت تک سیرت کی جدید ترین کتاب ہے اور بیک وقت سیرت،سوانح اور تنقید کی مٹھاس لئے ہوئے ہے۔آپ ادارہ صوت ہادی بھی چلا رہے۔

صوتِ ہادی

صوتِ ہادی اصل میں ایک ادبی پرچہ تھا جو مراتب اختر کے والدِ محترم اور سیّد سید علی ثانی کے دادا حضور سید محمد حسین گیلانی نے شروع کیا اور کچھ عرصہ بعد بوجوہ بند ہو گیا۔سیّد سید علی گیلانی نے صوتِ ہادی پرچہ بھی دوبارہ شروع کیا اور اسے ایک ادارہ کا رنگ دے کر کئی کتب بھی چھاپیں ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔صوت ہادی نے 5 خاص شمارے شائع کئے ہیں اور 12 کتب شائع کرنے کا اعزاز بھی اس ادارے کو حاصل ہے۔بلاشبہ یہ سید علی گیلانی کی ادب دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

سیّد عون الحسن غازی

سیّد عون الحسن غازی مراتب اختر کے بھانجے ہیں اور معروف شاعر اور ادیب ہیں۔انہوں نے مراتب اختر پر ایک کتاب ''نقد مراتب'' 2004 میں ترتیب دی اور مراتب اختر پر مجید امجد،افتخار جالب،ڈاکٹر سید محمد زکریا،ظفر اقبال،انور سدید،تبسم کاشمیری،ڈاکٹر گوہر نوشاہی،اور جعفر شیرازی جیسی معروف شخصیات کے مراتب کے فن وشخصیت کے حوالہ سے مضامین کو یکجا کر کے شائع کیا۔

عون الحسن کے بارے میں معروف ادیب ونقاد زاہد حسن لکھتے ہیں:

سید عون الحسن غازی جواں سال شاعر ہیں اور ان کی نظموں میں ان کے شباب کی آرزومندیوں کا خون جوش مارتا نظر آتا ہے۔لیکن یہ آرزومندی جب دردمندی میں تبدیل ہو جاتی ہے تو تخلیق جنم لیتی ہے۔تخلیق شاعری کی صورت میں اور تخلیق نثر کی صورت میں۔عون الحسن غازی دونوں اصناف میں اظہار کرتے ہیں اور ان کی نظموں کے مطالعہ سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ وہ معاصر عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتوں کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔خاص طور پر ان کی نظم ''بنجر ذہنوں کے اسیر'' اس امر کی غماز ہے کہ انہیں موجودہ عہد کی معاصر صورت حال کا کما حقہ ادراک ہے وہ کہتے ہیں:۔

آج ہوا کا رخ کس طرف ہے۔۔۔آج بادل کہاں جا کر برسیں گے۔۔

سب لوگ یہی بات۔۔۔ہر روز کیا کرتے ہیں۔(۱۸)

عون الحسن غازی کی شاعری نظموں کے مجموعہ کی صورت میں ''سیاہ آسمان میں'' کے نام سے 2007 میں چھپ چکی ہے۔عون الحسن غازی کی نظموں کے کچھ نمونے یہ ہیں:۔

فراق

آج قمری مہینے کی چودہ ہے
آج پھر چاند آسمان پر جگمگائے گا
ہاں! یہی تو رات تھی
اس سے بچھڑے جانے کی
ہاں۔۔۔!
آج پھر اس کی یاد میں

دل آنسو بہائے گا

بازگشت

کچھ نہ کہنا مجھے
کہ آج کل میرے بس میں کچھ نہیں ہے
جب شام
سرمئی چادر اوڑھ لیتی ہے
تمہاری کہی ہوئی ہر بات
میرے لیے
کانٹوں کی سیج بن جاتی ہے

اندازِ گفتگو

پھر ہونے لگی ہیں تنہائی سے باتیں
پھر گزرنے لگی ہیں خاموش راتیں
راتیں۔۔۔!
چیت کی چاندنی راتیں

حوالہ جات

۱۔ محمد طاہر حسین قادری، (ایڈیٹر)، ماہنامہ ''آئینہ کرم'' جھنگ، شمارہ ۳۳، جون ۲۰۱۲ء، ص ۱۳

۲۔ افضال حسین گیلانی، سیّد، حیات الامیر (جلد اوّل)، شیخوشریف: ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۶ء، ص ۵۳

۳۔ محمد طاہر حسین قادری (ایڈیٹر)، ماہنامہ آئینہ کرم، محولہ بالا، ص ۱۴

۴۔ افضال حسین گیلانی، سیّد، حیات الامیر (جلد اوّل)، ص ۳۷

۵۔ سید علی ثانی گیلانی، سیّد، شجرۃ اشراف، ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰۰

۶۔ اصغر علی گیلانی لاہوری، سیّد، شجرۃ انوار، (قلمی نسخہ)، شیخوشریف: گیلانی لائبریری، ص ۱۴۸

۷۔ افضال حسین گیلانی، سیّد، سوانح حیات سید حسن بخش المعروف حسنین سائیں، ص ۱۴

۸۔ افضال حسین گیلانی، سیّد، حیات الامیر (جلد دوّم)، محولہ بالا، ص ۴۱

۹۔ افضال حسین گیلانی، سیّد، حیات سیّد سید محمد گیلانی، شیخوشریف: ادارہ صوتِ ہادی، ص ۳۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۱

۱۱۔ سید علی ثانی، سیّد (ایڈیٹر)، سہ ماہی صوت ہادی (ناصر شہزاد نمبر، جنوری تا مارچ)، ۲۰۰۹ء، ص ۵۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۶۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۶۵

۱۵۔ افضال حسین گیلانی، سیّد، کافی اے یار داویہڑا، شیخوشریف: ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۷

۱۶۔ افضال حسین گیلانی، وناں دی چھاں تے سسی، ص ۱۱

۱۷۔ افضال حسین گیلانی، سیّد، کافی اے یار داویہڑا، ص ۲۸

۱۸۔ عون الحسن غازی، سیاہ آسمان میں، شیخوشریف: ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴

باب سوم

مراتب اختر کا توقیت نامہ

مراتب اختر کا توقیت نامہ

ساہیوال کی دھرتی جہاں اس بات پہ نازاں ہے کہ مولانا عطا اللہ جنون، مولانا عزیز الدین عظامی، حفیظ جالندھری، مجید امجد، منیر نیازی اور گوہر ہوشیار پوری جیسے نامور شعراء نے یہاں قیام کیا وہاں حاجی بشیر احمد بشیر، ناصر شہزاد، جعفر شیرازی، احسن شیرازی اور یٰسین قدرت کے علاوہ مراتب علی اختر کو بھی اسی دھرتی نے جنم دیا۔

سید مراتب علی اختر 8 مئی 1940 کو پیدا ہوئے۔ چار بھائیوں اور پانچ بہنوں میں ساتویں نمبر پر آتے تھے۔ ایک بہن اور ایک بھائی آپ سے چھوٹے تھے۔ میونسپل کمیٹی پرائمری سکول ایف برانچ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال سے پاس کیا۔ آپ کی تاریخ پیدائش کے حوالہ سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ کے چھوٹے بھائی سیّد افضال حسین گیلانی لکھتے ہیں:۔

> ہم دونوں بھائیوں کی عمروں کا درمیانی وقفہ صرف چار سال کا تھا۔ گھر میں ہم اوپر تلے کے بھائی گنے جاتے تھے۔ غور کیجئے بھلا بڑائی چھوٹائی کا یہ کوئی اتنا بڑا فرق ہے؟ یہ عمریں تو ہم جولیوں اور لنگوٹیے یاروں کی ہوتی ہیں۔ لیکن۔۔۔ حسبِ مراتب وہ اول دن ہی سے ''بہت بڑے'' اور میں بہت چھوٹا تھا۔
>
> امی حضور سے سنا تھا کہ جب بھائی جان چھ ماہ کے تھے تو انتہائی نحیف اور دبلے پتلے تھے۔ آپ کو حضرت بابا جی صوفی احمد شاہ صابر علیہ الرحمت کی خدمت میں پیش کیا گیا جو میرے نانا کے چھوٹے بھائی تھے اور خاندان بھر کے مرشد تھے۔ بلکہ گیلانی سادات کے مقتدر گھرانوں کے پیر و پیشوا تھے۔ اللہ کے سچے اور مقبول بندے تھے۔ آپ نے بچے کی کمزوری اور ناتوانی کو

دیکھتے ہوئے تبسم فرمایا۔ دم کیا اور پھر زیرلب گویا ہوئے۔'اس کو بیمار یا کمزور نہ سمجھو۔ اللہ اس کو بہت مرتبے عطا فرمائے گا۔ اس کو مراتب غوث کے نام سے پکارا کرو۔۔۔ واقعی! حقاً ومصدقاً اس دعا کی مقبولیتِ بارگاہ کی تصدیق، بھائی جان مراتب کی پوری حیاتی ہے اوران کے دوست احباب، ہم درس وہم مکتب، عقیدت منداور اہل خاندان سب ہی اس حقیقت کے گواہ ہیں۔ (۱)

مراتب اختر کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے درج بالا سطور پڑھنے کے بعد شکوک و شبہات اس لئے پیدا ہو جاتے ہیں کہ حضرت بابا جی احمد شاہ صوفی کی مصدقہ تاریخِ وفات ۱۱ رجب المرجب ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۳۹ء ہے(۲) اس لحاظ سے یہ بات واضع ہے کہ مراتب اختر ۱۹۳۹ء سے قبل پیدا ہوئے۔

اُن کی مذکورہ تاریخ پیدائش ان کے شناختی کارڈ اور تعلیمی اسناد کے مطابق درج کی گئی ہے۔ (۳)

سیّد مراتب علی اختر گیلانی سادات میں سے تھے۔ آپ کے والد محترم سیّد محمد حسین گیلانی خود تو شاعر نہ تھے مگر اردو، عربی اور فارسی پر عبور تھا۔ انہوں نے ایک رسالہ ''صوت ہادی'' بھی جاری کیا جو ان کی ادب پروری اور علم دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس سلسلہ میں سیّد افضال گیلانی لکھتے ہیں:۔

ہمارے والد قبلہ فارسی ادب کے فاضل دانندہ تھے۔ سعدی، رومی اور فریدالدین عطار کے ادب وکلام پر بے تکانی گفتگو اور درس فرمایا کرتے تھے۔ (۴)

سید مراتب علی اختر سیّد عبدالرزاق داتا شاہ چراغ لاہوری کی اولاد میں سے ہیں اور آپ کا سلسلہ نسب غوث بالا پیر سیّد بندگی محمد غوث اچوی اور سیّد عبدالقادر جیلانی سے ہوتا ہوا 33 ویں پشت میں حضرت علی مرتضیٰؓ سے جا ملتا ہے۔ سیّد مراتب علی اختر 19 اکتوبر 1971 کو رشتہ ازواج سے

منسلک ہوئے۔ اور ستمبر 1974 میں آپ کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جو چند دنوں کے بعد خالقِ حقیقی سے جاملا۔ آپ کے اہلِ خانہ اور عزیز و اقارب نے عقدِ ثانی کا مشورہ دیا لیکن آپ نے انکار کر دیا اور لاولد فوت ہوئے۔ آپ کا شجرۂ نسب کچھ اس طرح ہے:

سیّد مراتب علی اختر بن سیّد محمد حسین گیلانی بن سیّد سید علی گیلانی بن سیّد فضل علی شاہ بن سیّد سید محمد سائیں بن سیّد حسن بخش المعروف حسنین سائیں بن سیّد امام حیدر بخش بن سیّد اللہ بخش بن سیّد اسماعیل بن سیّد عبدالرزاق داتا شاہ چراغ لاہوری بن سیّد عبدالوہاب بن سیّد عبدالقادر ثالث بن سیّد محمد غوث بالا پیر بن سیّد زین العابدین بن سیّد عبدالقادر ثانی بن سیّد بندگی محمد غوث اچوی حلبی بن سیّد شمس الدین محمد حلبی بن سیّد حسن شاہ میر میراں بن سیّد ضیاء الدین علی بن سیّد نورالدین مسعود غازی بن سیّد احمد گنج بخش بن سیّد صفی الدین صوفی بن سیّد سیف الدین عبدالوہاب بن سیّد السادات محی الدین عبدالقادر جیلانی بن سیّد ابوصالح موسیٰ جنگی دوست بن سیّد عبداللہ ثالث الجیلی بن سیّد یحییٰ الزاہد بن سیّد محمد الرومی بن سیّد داؤد الامیر بن سیّد موسیٰ ثانی بن سیّد عبداللہ ثانی بن سیّد موسیٰ الجون بن سیّد عبداللہ المحض بن سیّد امام حسن المثنیٰ بن سیّد امام حسن المجتبیٰ بن سیّد علی المرتضیٰ (۵)

مراتب اختر کے ابتدائی زمانۂ طالبِ علمی کے حوالہ سے ان کے بھائی سیّد افضال حسین گیلانی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

میونسپل پرائمری اسکول ایف برانچ محلّہ فرید گنج اور محلّہ عید گاہ (دونوں محلوں کے درمیان واقع تھا) کے ہیڈ ماسٹر محمد صادق صاحب مرحوم بھائی جان کے انتہائی مشفق استاد تھے۔ بعد میں یہ احقر بھی اُن سے پڑھتا رہا۔ مقفیٰ و مسجع گفتگو کے علاوہ برجستگی اُن کے روز مرہ کی بات چیت کا نمایاں انداز تھا۔ اسی پرائمری اسکول کے ایک دوسرے استاد 'ضیاءؔ' صاحب پورا نام معلوم نہیں۔ ویسے بڑے مہربان محبت کرنے والے استاد تھے۔ نوجوان خوبصورت خوش لباس اور ماڈرن قسم کے اپ ٹو ڈیٹ ٹیچر

تھے۔ بچوں پر رُعب نہیں جھاڑتے تھے اور نہ ہی سخت کلامی سے حکم چلاتے بلکہ زبان حال سے نرم نگاہوں سے فہمائش کرتے کہ دیکھو جس طرح میں ہوں ایسا بننے کی کوشش کرو۔ (۶)

سیّد مراتب علی اختر نے پرائمری کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال میں داخلہ لیا۔ یہ ادارہ اس وقت بھی علاقہ کے اہم اداروں میں ایک تھا اور یہاں کے شاندار نتائج اور محنتی اساتذہ کا شہرہ دور دور تک تھا۔ طلبا کی ذہنی آبیاری کرنے والے یہ اساتذہ نہ صرف نصابی کتب کی طرف توجہ دیتے تھے بلکہ ہم نصابی سرگرمیوں میں خصوصاً تقاریر اور شعروشاعری سے دلچسپی رکھنے والے طلباء کی خصوصی طور پر رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔

جب بچپن سے لڑکپن کی سرحدیں ٹکرانے لگتی ہیں تو اس وقت دل میں کئی نئے ولولے اُٹھنے لگتے ہیں۔ اس وقت مناسب ماحول اور بہترین تربیت کرنے والے اساتذہ کی بہت ضرورت ہوتی ہے تاکہ جذبات مثبت انداز میں پروان چڑھ سکیں۔ مراتب اختر کو بھی گورنمنٹ ہائی سکول میں اساتذہ کی ایسی کھیپ میسر آئی۔ جس کا ذکر سیّد افضال گیلانی یوں کرتے ہیں:

> گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال کے دن بھی نہیں بھولتے۔ بھائی جان دسویں درجہ کے آخری سال میں تھے اور میں چھٹی میں داخل ہوا۔ ماسٹر احمد خان صاحب ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کے ریٹائر ہونے کے بعد شیخ محمد عبداللہ صاحب ہیڈ ماسٹر بنے۔ بھائی جان پر خصوصی محبت اور توجہ فرمانے والے استاد قاضی عبدالحمید صاحب، جناب عابد حسین صاحب، رانا غلام مرتضٰی صاحب اور بابا خورشید عالم صاحب تھے۔ جناب عابد حسین صاحب اردو، فارسی کے لیے بہت لائق فائق استاد تھے۔ ویسے عربی اور خصوصاً فارسی کی شُد بُد تو ہمیں اپنے گھریلو ماحول ہی سے حاصل تھی۔۔۔ انہیں ایام میں یعنی گورنمنٹ سکول کے دسویں جماعت کے سال میں بھائی جان کی شناسائی پروفیسر الف۔ دال نسیم صاحب سے ہوگئی۔ ان کو اکثر احباب اور طلباء اے ڈی نسیم کے معزز نام سے بھی پکارتے تھے۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال کے سینئر اور لائق ترین اساتذہ میں

شمار تھا۔ بھائی جان پر بڑے مہربان اور فریفتہ تھے۔ بھائی جان نے میٹرک اعلیٰ اور نمایاں میرٹ سے پاس کیا۔ (۷)

کالج کی زندگی ایسا دور ہوتا ہے جہاں پر باطنی صلاحیتوں میں نکھار آتا ہے۔ طلباء سکول کے گھٹن زدہ ماحول سے آزاد ہو کر ایک ایسے ماحول میں آتے ہیں جہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ کی رہنمائی کے علاوہ نسبتاً وسیع پیمانے پر ادبی ماحول میسر ہوتا ہے۔ یہ وہ دورانیہ ہے جب نوجوان اپنی منزلیں متعین کرتے ہیں اور خواہشات کو عملی روپ دینے کا آغاز کرتے ہیں۔ مراتب اختر کو گورنمنٹ کالج ساہیوال میں بوجوہ داخلہ نہ مل سکا تو انہوں نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے لیے گورنمنٹ کالج اوکاڑہ میں داخلہ لے لیا۔ جہاں آپ کو پروفیسر صابر لودھی جیسے استاد سے مستفیض ہونے کا موقع ملا اور چھ ماہ بعد ہی آپ نے پروفیسر صابر لودھی کی مشاورت سے اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں مائیگریشن کروالی۔ پروفیسر صابر لودھی مراتب اختر کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> میرا اُس سے عجیب انداز میں تعارف ہوا۔ 1958 میں میونسپل کالج اوکاڑہ کی بنیاد رکھی گئی۔ مجھے اردو پڑھانے کے لیے منتخب کیا گیا۔ اُس وقت انٹرمیڈیٹ کی سطح پر اردو زبان لازمی نہیں ہوئی تھی۔ آپشنل کے طور پر پڑھائی جاتی تھی۔ دیوان غالب کی ردیف ''ی'' نصاب میں شامل تھی۔ مجھے پڑھانے کا شوق تھا غور وفکر کی عادت بہت کم تھی۔ میں نے زور شور سے پڑھانا شروع کیا۔ پختہ عمر کے ایک طالبِ علم نے کسی لفظ کے معنی پوچھے۔ میں نے بتا دیئے۔ چھوٹے قد کا، سانولے سے رنگ والا یہ طالبِ علم مجھے سمجھ دار معلوم ہوا۔ اُس کے بعد تین چار دن تک کسی نے کوئی سوال نہ کیا۔ میں نے غالب پڑھاتے ہوئے دوسرے شاعروں کے شعر بھی سنائے۔ اس طالبِ علم کے سوا کسی نے داد نہ دی۔ پسندیدگی کے طور پر سر نہ ہلایا۔۔۔ میں نے طالبِ علم سے اس کا نام پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔ 'مراتب اختر'، 'مراتب اختر۔۔۔ شاعر'، 'جی ہاں۔۔۔' اور پھر خاموشی چھا گئی۔ (۸)

لاہور اگرچہ عرصۂ دراز سے ادبی سرگرمیوں اور تہذیب و ثقافت کا مرکز رہا ہے مگر قیامِ

پاکستان کے بعد ہندوستان سے بھی بہت سارے شعراء وادباء کی آمد نے اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ادبی سرمایہ میں مزید اضافہ کیا ہے۔نوجوان نسل بھی اس ماحول سے نہ صرف متاثر ہوئی بلکہ مستفیض ہوئی۔ضیاء جالندھری، ناصر کاظمی، احمد مشتاق اور منیر نیازی جیسی ہستیوں کے ہوتے ہوئے ادبی پرچوں اور مشاعروں کی فضا پیدا ہوئی ۶۰ کی دہائی تک پہنچتے پہنچتے گورنمنٹ کالج لاہور، اسلامیہ کالج، ایم اے او کالج اور پنجاب یونیورسٹی میں ادب کی آبیاری کا ایسا ماحول پیدا ہو چکا تھا جہاں سے فارغ التحصیل طلباء ادبی دنیا کا قیمتی اثاثہ ثابت ہوئے۔

مراتب اختر جب اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے تو وہیں رہائش اختیار کرنا پڑی۔مراتب اختر کے لاہور کے قیام کے دوران کئی اہم ادیبوں اور شاعروں سے روابط رہے اور بعض سے دوستانہ تعلقات بھی۔ وہ ادبی محفلوں کی جان تھے۔اُن کے ساتھ بیتے دنوں کا ذکر ڈاکٹر گوہر نوشاہی یوں کرتے ہیں:

> مراتب اختر اور میں دو سگے بھائیوں کی طرح کئی برس ساتھ رہے۔میرے گھر میں وہ افراد خانہ کی طرح جانے جاتے تھے۔وہ میرے ان چند بلکہ دو چار دوستوں میں سے ایک تھے جنہیں میرے گرامی قدر والد اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔بی۔اے تک ہم اکٹھے رہے، مراتب اختر کا قیام لوہاری دروازے کے اندر ایک تنگ و تاریک گلی میں ان کے والد گرامی کے ایک ارادت مند کے گھر میں تھا۔ہم جماعت اور ہم ذوق ہونے کے علاوہ مراتب سے قربت کا ایک رشتہ یہ بھی تھا کہ ہم دونوں اہل روحانیت اور درویشوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔حضرت نوشہ گنج بخش کے حوالے سے ہم بھی قادری سلسلے سے متعلق تھے اور مراتب اختر بھی گیلانی قادری منزل والے شیخو شریف کے سجادہ نشین کے صاحبزادے تھے۔میرے والد صاحب اس حوالے سے مراتب اختر کو بہت پسند کرتے تھے۔ (۹)

اسلامیہ کالج کے زمانہ میں مراتب اختر کا ادب کے جن طالب علموں سے واسطہ پڑا۔جن نئے لکھنے والوں سے تعلقات بنے اور جن لوگوں کے ساتھ مل کر انہوں نے ادبی محفلیں سجائیں ان میں

تبسم کاشمیری بھی تھے۔تبسم کاشمیری سے مراتب اختر کی ملاقات کا اہتمام گوہر نوشاہی نے کیا تھا۔ جو مراتب اختر اور تبسم کاشمیری کے مشترکہ دوست تھے۔تبسم کاشمیری اس پہلی ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> پہلی ہی ملاقات میں مجھے محسوس ہوا کہ ان سب لوگوں سے مراتب اختر کی غزلوں میں جدت اور نئے پن کا احساس زیادہ ہے۔ اس کی شگفتگی اور جمالیاتی طرز احساس یقیناً متاثر کرنے والا ہے۔ مجھے غزل سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی مگر اس کی غزل کا لب و لہجہ منفرد تھا اور کلاسیکی روایت سے ہٹا ہوا بھی تھا۔ 1960ء کے آس پاس کے دور تک کلاسیکی روایت غزل پر بری طرح حاوی تھی۔ موجودہ زمانے میں ہم جس نئی غزل کو دیکھتے ہیں اس زمانے میں غزل کا یہ رنگ و آہنگ نہایت خاموشی سے جدید نظم سے متاثر ہو کر اپنے نئے شعری وجود کو تلاش کر رہا تھا۔ مراتب کی غزلیں سن کر یوں لگا تھا کہ وہ مستقبل کی نئی غزل کا شاعر ہے۔ واقعتاً ایسا ہی تھا۔ کاش زمانے کی گردش اسے موقع دیتی، اسے یک سوئی اور طمانیت قلبی حاصل ہو سکتی اور تسلسل کے ساتھ شاعری کر سکتا تو یقیناً وہ ہمارے دور کا ایک بڑا نام بن سکتا تھا۔ مگر دُکھ یہ ہے کہ زمانے کے ستم کے ہاتھوں وہ دل جمعی سے شاعری نہ کر سکا۔ (۱۰)

ان دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں ہونے والی ادبی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ اور ملک بھر میں ان سرگرموں کو قابل تحسین سمجھا جاتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس وقت کے لاہور کے ادبی ماحول میں اسلامیہ کالج سول لائنز پورا دبستان تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کالج میں نوجوان شاعر اور ادیب ادب کی مختلف صنفوں میں نہ صرف اپنے آپ کو متعارف کروا رہے تھے بلکہ اپنے فن کا لوہا منوا رہے تھے اور بلاشبہ یہ سب کالج کے اساتذہ کی وجہ سے ہی ممکن تھا۔ اسلامیہ کالج سول لائنز کے اس دور کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کہتے ہیں:

> اسلامیہ کالج کے وہ ایام یادگار تھے۔ جب 1960ء میں گوہر نوشاہی، صابر کیفی، وحید اطہر، راؤ ارشاد، مراتب اختر، ذوالفقار احمد، زاہد فارانی اور راقم الحروف سول لائنز میں

پڑھتے تھے۔ ہر ہفتے پروفیسر سجاد باقر رضوی کی سوسائٹی ''ینگ رائٹرز'' کا زور دار اجلاس ہوتا تھا۔اس میں فاروق حسن، سجاد شیخ، شمشاد احمد، علی تجمل واسطی (مرحوم) اور دوسرے سینئر ساتھی شریک ہوتے تھے۔ باقر صاحب نے پروفیسر حمید احمد خاں کے تعاون سے ایک ایسی تنظیم تشکیل کی تھی کہ جو نوجوان لکھنے والوں کی ایک زرخیز تربیت گاہ کا درجہ حاصل کر گئی تھی۔ اس دور میں منیر نیازی نے ایک ادبی کالم حنیف رامے کے ماہوار رسالے ''نصرت'' میں شروع کیا تھا۔سول لائنز کالج سن ساٹھ کی دہائی میں نئی شاعری اور نئی تنقید کا مرکز بن رہا تھا اور اس کے اعتراف میں منیر نے یہ لکھا تھا کہ شاعری پہلے گورنمنٹ کالج میں پیدا ہوتی تھی۔مگر اب وہ گیٹ بدل کر سول لائنز میں داخل ہوگئی ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ اعزاز سول لائنز کالج کو مراتب اختر جیسے نوجوان شعراء کے طفیل ہی حاصل ہوا تھا۔ (۱۱)

ہمارے معاشرے میں والد کی وفات کے بعد بھائیوں میں انتشار نئی بات نہیں ہے۔شاید ازل سے ہی ایسا ہوتا آ رہا ہے۔ ویسے بھی والد، والدہ یا کسی قریبی عزیز کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جس سے انسان وقتی طور پر ضرور مفلوج ہو جاتا ہے۔مگر بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جس کی کمی زندگی بھر محسوس ہوتی ہے اور شاعر تو اس طبقہ فکر سے تعلق رکھتا ہے جو دوسروں کے غموں سے بھی ضرور متاثر ہوتا ہے۔خنجر کہیں چلیں زخمی ان کے جگر ہوتے ہیں۔ مراتب اختر کے والد کی وفات کے بعد ان کی زندگی بھی متاثر ہوئی۔ وہ بجھے بجھے سے رہنے لگے۔ گھریلو مسائل، خاندانی معاملات اور دیگر ذمہ داریوں کے سبب وہ تعلیم کی جانب پوری توجہ نہیں دے پا رہے تھے۔ پھر ایسا وقت آیا کہ آپ لاہور کو خیر باد کہہ کر ساہیوال آ بسے اور تعلیم کا سلسلہ نامکمل چھوڑ دیا۔مگر یہاں آ کر بھی انہوں نے کسی نہ کسی طرح ادب سے رشتہ جوڑے رکھا اور مسلسل لکھتے رہے بلکہ ملک کے نمائندہ ادبی جرائد میں ان کا کلام متواتر چھپتا رہا۔ فنون اور اوراق میں تو ان کا کلام (نظم و غزل) باقاعدگی سے چھپتا تھا۔ان کی لاہور سے ساہیوال منتقلی کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:۔

بی۔اے (62-1960ء) کی تعلیم کے دوران میں مراتب آہستہ آہستہ پریشان نظر

آنے لگا تھا۔ اس کی ہنسی اور قہقہے نامعلوم طور پر پھیکے پڑنے لگے تھے۔ وہ شخص جو زندگی کی سرگرمیوں سے ہمیشہ مسرور نظر آتا تھا اب اکثر غم زدہ دکھائی دینے لگا تھا۔ میری سمجھ سے یہ سب کچھ باہر تھا کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔۔۔؟ تعلیمی سیشن کے دوران ہی وہ کبھی کبھی ساہیوال کا رخ کرتا اور کئی کئی دن کالج سے غائب رہتا۔ مجھے تشویش ہونے لگی تھی کہ اس روش سے وہ اپنا سال برباد کر لے گا۔ درمیان میں وہ دوبارہ کالج میں آجاتا تھا لیکن اس کی زندگی میں اب باقاعدگی نظر نہ آتی تھی۔ میں سمجھنے لگا تھا کہ شاید کسی رومانس کی نذر ہو گیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کو بہت ذاتی اور داخلی خیال کر کے اس سے کچھ پوچھنے کی کبھی ہمت نہ کی۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا جب وہ دوستوں سے مل کر ساہیوال گیا ہم سمجھتے تھے کہ ہفتے عشرے میں لوٹ آئے گا۔ میں اُسے مسلسل یاد کرتا رہا۔ سب دوست مسلسل اس کا ذکر کرتے رہے مگر وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے پھر لوٹ کر نہ آیا۔ میں پریشان ہو کر اسے خط پہ خط لکھتا رہا۔ جواب آتا کہ آ رہا ہوں۔ مگر وہ نہ آسکا۔ (۱۲)

گھریلو حالات، معاشی مجبوریاں اور وقتی پریشانیاں خواہ جتنی بھی شدید ہوں کسی شاعر یا ادیب کی اس خواہش کو نہیں دبا سکتیں کہ اس کا کلام عوام اور قارئین تک نہ پہنچے۔ مراتب اختر کے سینے میں بھی جوان دل دھڑکتا تھا اور ان کی شاعری کو بھی لوگ بہت پسند کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے شعری مجموعوں کی اشاعت میں گہری دلچسپی لی۔ ان کے پہلے شعری مجموعہ ''جنگل سے پرے سورج'' کی اشاعت کے حوالے سے مراتب اختر کے دوست ڈاکٹر تبسم کاشمیری یوں بیان کرتے ہیں:

> 1962ء کے آخر میں ہی اس نے اپنا مرتب کردہ پہلا شعری مجموعہ ''جنگل سے پرے سورج'' میرے سپرد کیا اور کہا کہ اس کی اشاعت کا اہتمام کرو۔ میں نے اس مجموعے کی کتابت ایک عمدہ کاتب سے کروائی اور اپنے دوست امان عاصم صاحب (مکتبہ ادب جدید لاہور) کو اشاعت کے لیے مواد فراہم کیا۔ وہ اس مجموعے کی اشاعت کے لیے بے قرار تھا اور مجھے مسلسل ہدایات ارسال کرتا رہتا تھا۔ حسن اتفاق سے اس وقت 10 جنوری 1963ء کا ایک خط میرے پاس موجود ہے اس نے اشاعتی امور کے

بارے میں مجھے یہ باتیں لکھی تھیں۔'غزلیں جس ترتیب سے چاہو شامل کرلو۔ یہ ایک ہی وقت کی پیداوار ہیں۔۔۔ ٹائٹل بہرکیف سہ رنگا ہو۔ اسے ہر ممکن کوشش سے خوبصورت بنانا۔ میں ذاتی طور پر کوئی آئیڈیا آرٹسٹ پر ٹھونسنا نہیں چاہتا۔ آپ کتابوں، ٹائٹلوں کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں یا عباس اطہر کو ساتھ ملا لیں، یعنی کوئی آئیڈیا اس سے پوچھ لیں۔ (۱۳)

60 کی دہائی میں ساہیوال میں اردو ادب نے نمایاں ترقی کی ۔ بزمِ قمر کے ماہانہ مشاعرے، جوگی ہوٹل اور کیفے ڈی روز کسی طرح بھی لاہور کے ''پاک ٹی ہاؤس'' سے کم نہ تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مجید امجد، گوہر ہوشیار پوری، ڈاکٹر الف دلنسیم ، قیوم صبا اور سجاد میر جیسے نامور شعراء نے ساہیوال کو مثالی ماحول میسر کر رکھا تھا۔ مراتب اختر نے بھی اپنے آپ کو اس ادبی ماحول کا حصہ بنالیا۔ ان کے انہی شب و روز کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بھانجے عون الحسن غازی لکھتے ہیں:

ساہیوال میں ان کی محفلیں مقبول عالم میڈیکوز کے پروپرائیٹر خورشید عالم کے یہاں جمتی تھیں۔ جہاں قیوم صبا، حافظ عبدالرحمٰن، مسعود حیدر بخاری، انوار الحق اور سجاد میر وغیرہ شرکت کیا کرتے تھے۔ (۱۴)

پھر ایک وقت آیا کہ آپ نے شعر و شاعری سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی اور مکمل طور پر صوفیانہ روش اختیار کر لی اور اپنے آباؤ اجداد کی طرح تبلیغ دین میں مصروف ہو گئے۔ عون الحسن غازی اس بارے میں کہتے ہیں:۔

بعد کی زندگی میں ان کا رجحان زیادہ مذہب اور تصوف کی طرف ہو گیا۔ انہوں نے اپنی داڑھی سنتِ نبوی ﷺ کے مطابق بڑھالی اور ذکر و فکر میں مشغول رہنے لگے۔ وہ عظیم شاعر جس کا اٹھنا بیٹھنا مجید امجد، خواجہ زکریا، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، گوہر نوشاہی، جیسے لوگوں میں تھا انہوں نے ادب سے تمام دلچسپیاں سمیٹ کر (رول بیک کر کے) گھر بھر کی کفالت اپنے سر لے لی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں خلق خدا سے ''غوث'' کا لقب حاصل کرنے والے اس عظیم انسان نے اپنی زندگی کے فکری، فنی، اور شخصی

خصائص کو اپنے خاندان میں تقسیم کر دیا۔ (۱۵)

ایک کامیاب ادیب کی یہ خوبی ہے کہ وہ کتب بینی سے اپنا رشتہ نہیں توڑتا۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس آدمی کا جتنا زیادہ مطالعہ ہوگا اسے اپنا مافی الضمیر اور مُدعا بیان کرنے پر بھی دسترس ہوگی۔ سید مراتب علی اختر کے کلام کے مطالعے کے بعد یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ انہیں نہ صرف اردو بلکہ انگریزی، عربی اور فارسی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ اور ان کے کتب خانہ میں ان علوم کی کتب کا ذخیرہ بھی موجود تھا۔ اس حوالے سے ان کے بھتیجے سیّد سید علی گیلانی لکھتے ہیں:

> بہر حال ان کی تعلیم جس معیار کی بھی ہو ان کو چار زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ میں نے ان کے کتب خانہ کو 'الف تا یا' دیکھا زیادہ تر کتابیں اردو ادب کی ہیں جن میں بیشتر آج کل نایاب ہیں اور اس کے بعد دوسرا بڑا ذخیرہ فارسی ادب کا ہے جس میں مثنوی مولانا روم، حضرت سعدی و خسرو، حضرت اقبال کا فارسی کلام اس کے علاوہ دیوانِ انوری، دیوان حافظ شیرازی، رباعیات عمر خیام، دیوان قصاب کاشانی، جامی، فرید الدین عطار، حکیم سنائی، ابوالمجد، مجدود بن آدم اور مرزا غالب کی 234 فارسی غزلوں پر مشتمل کتاب اور دوسری لاتعداد کتب موجود ہیں۔ تیسرا اور سب سے بڑا حصہ انگریزی ادب کا ہے جس میں بے شمار ناول Drama، Fiction موجود ہیں۔ ان کتب کی تعداد دوسری کتب کی نسبت زیادہ ہے اور پھر جا بجا کشیدہ خط اور الفاظ کی Defination اس بات کی متقاضی ہے کہ انہوں نے ان کو بغور پڑھ رکھا ہے۔ شاید اسی لئے ان کی شاعری انگریزی ادب سے متاثر ہے۔ (۱۶)

سیّد مراتب علی اختر انتہائی ملن سار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا ایک مرید شہامند خاں بلوچ جو دریا راوی کے کنارے گاؤں داد بلوچ کا رہائشی تھا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ حضور کبھی میرے گھر بھی تشریف لائیں۔ آپ نے آنے کا وعدہ کیا اور حسبِ وعدہ داد بلوچ پہنچ گئے۔ عارضۂ قلب میں تو پہلے سے مبتلا تھے اچانک دل کا درد ہوا اور 25 دسمبر 1988 کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ سیّد سید علی گیلانی اس حوالہ سے یوں رقم طراز ہیں:

حسبِ وعدہ داد بلوچ ضلع ساہیوال عین دریائے راوی کے کنارے شہامند خان بلوچ کے ہاں جا پہنچے۔عقیدت مند مریدین سے ملاقات جاری رہی رات کے کھانے کے بعد بھی بات چیت ہوتی رہی۔۔۔ اتنے میں سید مراتب اختر نے فرمایا۔ افضال! تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں تم آرام کرو اور میں ذرا باہر چہل قدمی کر آؤں۔دریا کے کنارے موسم خوشگوار ہو گا اور اپنے چند عقیدت مندوں کو ساتھ لے کر باہر نکلے۔ ساتھیوں کا بیان ہے کہ انہوں نے تھوڑی دور جا کر ایک ٹھنڈی سانس لی اور رک گئے۔واپس مڑ کر دیکھا قیام گاہ سے تھوڑی دور نکل چکے تھے۔۔۔ پھر چل دیئے پھر چلتے چلتے مڑ کر دیکھا ساتھیوں نے عرض کی سائیں جی! کیا دیکھ رہے ہیں۔کیا کوئی بات بھول گئی ہے، کہا نہیں تو! پھر چل دیئے چند قدموں کے بعد تیسری بار مڑ کر دیکھنا چاہتے تھے کہ چکر آ گیا اور گر پڑے۔بے ہوشی طاری ہو گئی۔ہمراہی گھبرا گئے۔اور اسی سٹاپٹ میں ان کو گاؤں میں لایا گیا۔ڈرائیور غلام فرید، سید افضال حسین اور حافظ اشرف لے کر ساہیوال ڈاکٹر ارشد جمال کے ہاں آ گئے وہ بھی اب کلینک آف کر کے جانے والے تھے انہوں نے چیک کرنے کے بعد کہا کہ افسوس! شاہ جی تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے رحلت فرما چکے ہیں۔(۱۷)

یوں ادب کے افق پر طلوع ہونے والا یہ نیا سورج شعر وسخن کی دنیا کو ایک نئے لہجے سے متعارف کرواتا ہوا جنگل سے پرے ڈوب گیا جبکہ اس کی سنہری کرنیں ہمیشہ ادبی دنیا کو منور کرتی رہیں گی اور ادب کے نئے طالب علموں کے ذہنوں کو غزل کے نت نئے سانچے اور ڈھانچے فراہم کرتی رہیں گی۔ قارئین ان کی شعری بندشوں، نئے رجحانات، جدت پسندیوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔بلا شبہ مراتب اختر اپنے عہد کے نام ور شاعر گردانے جاتے ہیں اور 60 کی دہائی میں شعر وادب کو نئے سانچے میں ڈھالنے والے اس گروہ میں شامل ہیں جنہوں نے ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کو ترجیح دی۔مراتب اختر کا شمار نہ صرف جدید نظم گو شعرا میں ہوتا ہے بل کہ انھوں نے غزل کو بھی نئے رنگ، آہنگ اور تراکیب سے متعارف کروایا۔

کتابوں کا تعارف

آٹھ غزل گو

آٹھ غزل گو جدید شاعروں کے کلام پر مشتمل وہ کتاب ہے جسے جاوید شاہین نے ۱۹۶۸ئمیں مرتب کیا۔اس کتاب میں ان جدید غزل گوشعرا کا مختلف شاعروں اور نقادوں نے تعارف بھی لکھا ہے اور منتخب کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ آٹھ شعراء جنھوں نے نئی غزل کے متعدد تجربات کرتے ہوئے غزل کو نئی جہت بخشی ۔ پرانے اسلوب سے بغاوت کر کے نئے اسلوب تخلیق کئے۔ ڈکشن کے نت نئے تجربات کئے۔ زمانے کے دکھوں اور مصیبتوں کو سادہ الفاظ میں بیان کرنے کی روایت ڈالی۔ پرانے لسانی ڈھانچے توڑ کر نئی لسانی تشکیل واضح کی۔ نئی علامتیں، استعارے، تمثیلیں ایجاد کیں۔ اسلوب میں ندرت پیدا کی۔ نئی تراکیب تخلیق کیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ تمام شعرا جدید غزل کے معمار اور بانی ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ان شعراء میں منیر نیازی، ظفر اقبال، جاوید شاہین، سلیم شاہد، انور شعور، نذیر قیصر، مراتب اختر اور ریاض مجید بالترتیب شامل ہیں۔

منیر نیازی کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے اگرچہ غزل بھی لکھی مگر ان کی غزل پر بھی نظم کے نقوش گہرے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل کا اسلوب منفرد ہے۔ ڈاکٹر انیس ناگی منیر نیازی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> منیر نیازی ان معدودے چند غزل گو شعراء میں سے ہے جس نے غزل لکھتے ہوئے بھی غزل کی روایت کی مجاورانہ پیروی نہیں کی۔ نہ جانے کیوں منیر نیازی کی بیشتر غزلیات پڑھ کر تنہائی کا احساس شدید اور گہرا ہو جاتا ہے اور اس کا محاکاتی طریقِ ادراک ذہن میں بیک وقت ادبی لذت اور ہم عصری جذباتی صورت حال کے نقش کو شوخ اور محکم کر دیتا ہے۔ شاید اس لیے منیر نیازی اپنے زمانے سے دور نہیں، اس کی آگہی اور شعور تجربے کی ہم عصری میں بروئے کار ہیں۔ (۱۸)

جدید غزل گو شعراء میں ظفر اقبال کا نام اہم ہے۔ اسلوبِ بیان کی برجستگی اور لہجے کا کرارہ اور تیکھا پن، بیان کی روانی، خیال کی تازگی اور پختہ شاعری سمیت غزل کی تمام بنیادی صفات ظفر اقبال کی شاعری میں موجود ہیں ظفر اقبال نے غزل میں جدید اسلوب کو اختیار کیا۔ ان کے بارے میں جاوید شاہین لکھتے ہیں:

> حقیقت میں ظفر اقبال دو اور دو چار کے قائل نہیں۔ اس کا تجسس اشیاء کو ان کے روز مرہ کے تناظر اور روایتی پس منظر میں دیکھنے اور قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ تجربے پر یقین رکھتا ہے۔ مگر تجربہ الہامی کیفیت کی طرح خود بخود نہیں آتا بلکہ پورے ہوش و حواس کو مجتمع کر کے کیا جاتا ہے۔ تجربے کے دوران عام اشیاء کے نئے روپ، نئی اطراف اور نئے معانی کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے ان کی شکست و ریخت ناگزیر ہے۔ ظفر اقبال کے اشعار میں زبان و بیان کے انہیں تجربات کی بدولت تر و تازہ تراکیب، نئے لفظی رشتوں اور منفرد فکری علامتوں کا وسیع ذخیرہ ملتا ہے۔ (۱۹)

جاوید شاہین کا شمار بھی جدید غزل گو شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں نئی معنویت اور نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اجنبی الفاظ کے استعمال سے اسلوب میں ندرت پیدا کی گئی ہے۔ جاوید شاہین کے بارے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> جاوید شاہین کی غزلیں دیکھیے، آپ کو ایک ایسا شاعر ملے گا جو اپنے فن کے اعتبار سے موجودہ دور کے ان تمام غزل گو شاعروں سے مختلف ہے جو اپنے آپ کو شاعر کہتے ہیں۔ لیکن سوائے اجنبی الفاظ کے موقع بے موقع استعمال کے ان کے ہاں کسی قسم کے نئے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ (۲۰)

سلیم شاہد کی غزل میں دنیاوی مسائل اور عصری صورتِ حال واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ان کے اسلوب میں انفرادیت بھی ہے اور جدت بھی ہے۔ شفقت تنویر مرزا سلیم شاہد کے بارے میں کہتے ہیں:

> دریا اور بکھرے ذروں کا الجھا ہوا ربط سلیم شاہد کے شعروں میں بار بار آتا ہے جسے آپ

مادی سطح پر برپا خلف شار میں 'روحانی آہنگ' کی تلاش کے لیے ایک بے چین روح کی تڑپ پر بھی معمول کر سکتے ہیں۔ پانچ دریاؤں کی اس سرزمین میں بے چینی کے اظہار کا وسیلہ روائتی اشیاء کے اسماء سے نہیں بلکہ پانی، طغیانی، ہوا، طوفان، کھیت، پتوں اور لہو کو بنایا گیا ہے یوں شعر میں ایک خاص قسم کی بپھری ہوئی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ (۲۱)

انور شعور جدید غزل گو شعراء میں معروف نام ہے۔ ان کا اسلوب سادہ ہے اور غزلیات روزمرہ زندگی کی عکاس، جدید لفظوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ منظر کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ ردیف اور قافیہ کو یکجا کیا ہوا ہے۔ انور شعور کی شاعری کے بارے میں محمد سلیم الرحمٰن کی رائے ہے:

> انور شعور نے جو راستہ اپنے لیے چنا ہے وہ بہت دشوار ہے کہ اس پر چلتے چلتے آدمی جلدی زچ ہو جاتا ہے۔ اس سفر میں جو زادِ راہ درکار ہے اس میں نفرت، طنز اور صاف گوئی کے علاوہ محبت اور دردمندی بھی ہونی چاہئے تا کہ اس 'زینۂ ذات کے سفر' کی روداد ایک ایسا آئینہ بن جائے جس میں ہر زمانے کے انسان کو اپنی صورت نظر آئے۔ (۲۲)

نذیر قیصر کی غزل میں ارتقائی عمل جاری ہے ان کے کلام میں کائنات کا انسانی وجود نمایاں ہے دھیمے لہجے کے شاعر نذیر قیصر نے غزل میں جدید اسلوب اپنایا ہے۔ وہ ذات کا عرفان چاہتا ہے۔ انسان اور کائنات کے باہمی ربط کو جاننا چاہتا ہے ان کے بارے میں ستار طاہر لکھتے ہیں:

> ان حقیقتوں کو وہ اپنے الفاظ، اپنے جذبات اور احساسات کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ سمبالزم اور باطن نگاری کے سہارے اس نے بھرپور تاثریت کا کام لیا ہے۔ اس کی علامتیں اس کے اپنے سفر کی روداد سے جنم لیتی ہیں۔ سفر کی راہوں میں پھیلے ہوئے رنگ اور خوشبو میں روح اور مادے کی علامتیں ہیں۔ (۲۳)

غزل کی جدید روایت کو جنم دینے والے شعراء میں ریاض مجید کا نام بھی اہم ہے۔ انہوں نے غزل میں جدید تجربات کیے۔ ان کے کلام میں جوش، سادگی اور بے ساختہ پن نمایاں ہے۔ ان کی

شاعری میں جدید لہجہ واضح نظر آتا ہے۔ ریاض مجید کے بارے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا کہنا ہے:

> ریاض مجید کی ان غزلوں میں بُعد اور قربت کے ایسے خوب صورت تجربے ملتے ہیں کہ آدمی پڑھتے ہوئے بعض اوقات اپنے آپ کو تبدیل ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ یہ تجربے آپ میں سے ہر شخص کے جذبات کا حصہ ہیں اور ان سے متاثر ہوئے بغیر آپ کبھی نہیں رہ سکتے۔ (۲۴)

مراتب اختر کا شمار بھی جدید غزل گو شعراء میں ہوتا ہے انہوں نے اپنی شاعری میں جدید تجربات کئے۔ نئے لفظوں کا استعمال ان کے اسلوب میں نمایاں ہے۔ مراتب اختر کی غزلیات پر افتخار جالب نے ایک مضمون تحریر کیا ہے:

> مراتب اختر نے جو شاعری کی ہے اس میں رکھ رکھاؤ، ڈکشن کی ملائمت، نفاست اور مروّجہ شعریت نہیں ہے۔ سب کچھ اکھڑا اکھڑا دکھائی دیتا ہے۔ یہ خرابیاں کہ امکان سے نابلد، اندھے اور بے مغز لوگوں کو گراں گزرتی ہیں درحقیقت مراتب اختر کی خالص خوبیاں ہیں۔ ان خوبیوں سے مستفید وہی ہوسکتا ہے جو شعر کی منزّہ صورت کو پہچان سکتا ہے۔ (۲۵)

مراتب اختر کی تصانیف

مراتب علی اختر کے اب تک چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں سے دو مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہوئے اور دو ان کے وفات کے بعد۔ ان کی وفات کے بعد شائع ہونے والے دونوں مجموعے ان کے بھائی سیّد افضال حسین گیلانی کی کوششوں سے شائع ہوئے۔ مراتب علی اختر وہ ہستی تھے جنہوں نے شعر و ادب کے میدان میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ مگر ان کی شخصیت میں بے نیازی کا عنصر غالب تھا اس لئے انہوں نے کبھی نہ اپنے آپ کو شناخت کرانے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی داد کی تمنا۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ تخلیق ستائش کے بغیر پروان نہیں چڑھتی اور فنکار کو فن کی داد نہ دی جائے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ مگر مراتب علی اختر کے حالات زندگی اس بات کے عکاس ہیں کہ نہ تو

انہوں نے شہرت کی تمنا کی اور نہ ہی اپنے آپ کو منوانے کی کاوش۔ وہ مدلل گفتگو کرنے والے کم گو انسان تھے اور نمود و نمائش سے بے زار تھے۔ ان کی پہلی کتاب ''جنگل سے پرے سورج'' 1964 میں شائع ہوئی جس کا دوسرا ایڈیشن اپریل 2007 میں ادارہ صوت ہادی شیخوشریف نے شائع کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ مراتب اختر نے اس کتاب کا انتساب اپنے مادرِ علمی یعنی اسلامیہ کالج لاہور کے ینگ رائٹرز کے نام کیا ہے۔ اس کتاب میں 68 غزلیات ہیں۔ 102 صفحات پر مشتمل اس کتاب کا پیش لفظ مراتب اختر نے خود لکھا ہے۔ اس کا فلیپ معروف نقاد اور ادیب ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے لکھا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل غزلیات ان کے عہد شباب کی عکاس ہیں۔ اس عمر میں ایک نوجوان شاعر کے جو جذبات اور احساسات ہو سکتے ہیں۔ ''جنگل سے پرے سورج'' میں ان کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ معاشرتی آلام و مصائب رشتوں کی تلخیاں، رواجوں کی سختیاں اور فطرت کی کرشمہ سازیاں سب کچھ اس مجموعہ میں موجود ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مراتب علی اختر کا یہ شعری مجموعہ ان کے نوجوان دل کی دھڑکنوں کا احساس ہے۔

مراتب علی اختر کی دوسری شعری کاوش 1965 میں ''حصارِ حال'' کے نام سے شائع ہوئی مگر بدقسمتی سے ناشرین کی لاپرواہی اور عدم توجہی کے باعث یہ مجموعہ شائع ہونے کے باوجود محفوظ نہ رہا۔ اس کی دو تین کاپیاں ڈمی کی صورت میں سامنے آئی تھیں جن میں سے ایک مراتب اختر نے مجید امجد کو دے دی تھی۔ اس کتاب کا انتساب ان کے کالج فیلو اور بہترین دوست تبسم کاشمیری کے نام ہے۔ اس کتاب کا صرف ایک شعر اب تک محفوظ ہے۔

در ہوں حصارِ حال کا وا ہو رہا ہوں میں
میری مراجعت ہے 'جو تھا' ہو رہا ہوں میں

حصارِ حال کے حوالے سے مراتب علی اختر کے بھتیجے سیّد علی گیلانی نے بتایا ہے کہ:

> مراتب علی اختر کے اس مجموعے کی اشاعت ان کے کالج فیلو ذوالفقار احمد کے ذمہ تھی
> جن دِنوں کتاب اشاعت کے مراحل سے گزر رہی تھی ذوالفقار احمد کی شادی کی

تیاریاں بھی جاری تھیں۔ادھر کتاب چھپ کر آئی اُدھر ذوالفقار احمد کی شادی ہوگئی اور وہ ہنی مون منانے چلے گئے۔ذوالفقار کا گھر کچھ خستہ حال تھا اور بدقسمتی سے ان دِنوں شدید بارشیں، برسیں چھتیں ٹپکنے لگیں۔ پانی گھروں کے اندر چلا گیا۔ بارش نے مکینوں کو بہت پریشان کیا اور جو لوگ اپنے گھروں میں موجود نہیں تھے ان کا بہت نقصان ہوا اور حصار حال بھی انہی بارشوں کی نظر ہوگئی۔ جب ذوالفقار احمد ہنی مون سے واپس آئے تو گھر کی دیگر اشیاء کے ساتھ حصار حال کو بھی تباہ پایا۔ (۲۶)

سیّد مراتب علی اختر کا تیسرا مجموعہ کلام ''گنجِ گفتار 2001 میں چھپ کر سامنے آیا۔اس مجموعے کے ناشران کے چھوٹے بھائی افضال حسین گیلانی ہیں۔ترتیب وتدوین کا اہتمام ان کے بھتیجے سیّد سید علی ثانی گیلانی نے کیا ہے۔جبکہ اس کے اہتمامِ اشاعت کی ذمہ داری مراتب اختر کے بھانجے سیّد عون الحسن غازی نے نبھائی ہے۔اس کتاب کا انتساب کسی کے نام نہیں۔اس کی وجہ افضال حسین گیلانی یہ بتاتے ہیں:

نقد ونظر کا حق اہل فکر وادب کا ہے اور انتساب خود بھائی جان کا حق تھا۔اگر وہ ہوتے تو کسی کے نام کرتے غالباً مجید امجد یا ینگ رائٹرز اسلامیہ کالج کے نام کیونکہ انہوں نے ہمیشہ انہی ہستیوں کے لئے ہی لکھا۔ (۲۷)

'گنجِ گفتار' میں مراتب علی اختر کی 102 غزلیات شامل کی گئی ہیں۔ اور یہ کتاب 220 صفحات پر مشتمل ہے۔حصار حال کے بعد جب گنجِ گفتار چھپ کر سامنے آئی تو پینتیس سال بیت چکے تھے۔اس طویل وقفے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں مراتب اختر کا رجحان تصوف کی طرف زیادہ ہوگیا تھا۔اور پھر ایک دن وہ تمام دنیاوی معاملات ادھورے چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔کتاب کے شروع میں تین عدد حمد ہیں۔اس کے بعد چھ نعتیں اور پھر غزلیں ہیں۔کتاب کا دیباچہ بعنوان ''حفظِ مراتب'' سیّد افضال حسین گیلانی نے لکھا ہے۔کتاب پر تبصرہ بعنوان ''مراتب اختر کی غزلیں'' مجید امجد کا تحریر کردہ ہے جو انہوں نے بہت پہلے 1968 میں ماہِ نامہ ''ادبِ لطیف'' میں

لکھا تھا۔

گنج گفتار کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ مراتب اختر نے اپنی غزلیات میں اپنے مسائل کے علاوہ داخلی اور خارجی موضوعات پر بھی بات کی ہے۔ انہوں نے حقائق کی پردہ کشائی خوبصورت انداز میں کی ہے۔ مجموعہ میں شامل غزلیات کی فنی خوبیاں مراتب اختر کے قادرالکلام شاعر ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

''گزرا بن برسے بادل'' مراتب اختر کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس میں مختلف عنوانات سے 45 نظمیں ہیں جبکہ 44 نظمیں بلاعنوان ہیں اور آخر میں 6 گیت ہیں۔ 216 صفحات پر مشتمل یہ کتاب ادارہ صوت ہادی نے شائع کی ہے۔ 2004ء میں شائع ہونے والی اس کتاب کے ناشر سیّد سید علی گیلانی ہیں جبکہ ترتیب و تدوین کی ذمہ داری ان کے بھانجے سیّد عون الحسن غازی نے نبھائی ہے۔ کتاب کا انتساب ''مراتب اختر کے تمام دوستوں کے نام'' کیا گیا ہے۔ کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر خواجہ ذکریا نے تحریر کیا ہے جبکہ فلیپ پر تبسم کاشمیری اور امجد اسلام امجد نے اظہار خیال کیا ہے۔ ''گزرا بن برسے بادل'' میں معاشرتی، نفسیاتی اور سیاسی مسائل کے علاوہ وطن سے محبت کی نظمیں بھی موجود ہیں۔ مگر کتاب کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد قرآن کریم کی کچھ سورتوں کا ترجمہ آزاد نظم کی صورت میں شامل ہے۔ گیتوں کی تعداد اگرچہ کم ہے مگر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان میں بھی رومانیت کا خوبصورت اظہار سامنے آتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ افضال حسین گیلانی، مضمون مشمولہ: نقدِ مراتب، مرتبہ عون الحسن غازی، شیخوشریف: ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۴ء، ص ۸۴

۲۔ ایضاً، ص ۸۷

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ انٹرویو، سیّد علی ثانی گیلانی، تاریخ ۲ دسمبر ۲۰۱۲ء

۶۔ افضال حسین گیلانی، ص ۸۶

۷۔ ایضاً، ص ۸۶

۸۔ ایضاً، ص ۶۶

۹۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، سید مراتب اختر کی یاد میں مشمولہ: نقدِ مراتب، ص ۶۳

۱۰۔ تبسم کاشمیری، مراتب اختر کی یاد میں، مشمولہ: نقدِ مراتب، ص ۵۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۸

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۴۔ عون الحسن غازی، مشمولہ: نقدِ مراتب، ص ۱۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۱

۱۶۔ سید علی گیلانی، سیّد، حسبِ مراتب، شیخوشریف: ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۶ء، ص ۳۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۱۸۔ جاوید شاہین، (مرتب) آٹھ غزل گو، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۶۸ء، ص ۱۲

۱۹۔ ایضاً،ص۳۳

۲۰۔ ایضاً،ص۶۳

۲۱۔ ایضاً،ص۸۹

۲۲۔ ایضاً،ص۱۱۸

۲۳۔ ایضاً،ص۱۴۹

۲۴۔ ایضاً،ص۱۹۴

۲۵۔ ایضاً،ص۱۷۳

۲۶۔ انٹرویو،سیّدسیدعلی گیلانی،تاریخ ۲دسمبر۲۰۱۲ء

۲۷۔ مراتب اختر،گنج گفتار،شیخوشریف:ادارہ صوتِ ہادی،۲۰۰۱ء،ص۱۳

باب چہارم

مراتب اختر کی شاعری کا پس منظر اور معاصر منظر نامہ

مراتب علی اختر کی شاعری کا پس منظر

تغیر و تبدل انسانی زندگی کا خاصہ ہے اور تخلیقِ آدم سے ہی شاید یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اگر مختلف تہذیبوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ تہذیبوں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زبان و ادب بھی متاثر ہوتا رہا اور اس میں بتدریج تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ادب معاشرے کو متاثر کرتا ہے اور معاشرہ ادب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اُردو زبان بھی ابتدائی دور میں فارسی ادب سے زیادہ متاثر ہوئی۔ اُردو کی ابتدائی شاعری کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ہمارے شعراء نے بھی وہی گل و بلبل کے قصے اور محبوب کی بے وفائی کو شاعری کا موضوع بنایا۔ اگر چہ مرزا مظہر علی خاں کو بعض ناقدین اُردو شاعری کی کثافت کو کم کرنے کا معمارِ اوّل سمجھتے ہیں اور میر تقی میرؔ نے بھی یہ دعویٰ کیا تھا۔

اِس بات پر تمام ناقدین متفق ہیں کہ اُردو شاعری میں جدت کی بنیاد مولانا الطاف حسین حالیؔ نے رکھی۔ اگر چہ اِس سے پہلے نظیر اکبر آبادیؔ بھی شاعری کو اُمرا کی محفلوں سے نکال کر غرباء کے مساکن اور گلی محلوں تک لے آئے تھے۔ مگر حالی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اس بنیاد پر بہت بڑی عمارت کھڑی کر دی۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ اس حوالے سے ''مجموعہ نظم حالی'' میں جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری، مقصدیت اور سادگی کو شاعری کا لازمہ قرار دیتے ہیں۔ (۱)

مولانا الطاف حسین حالیؔ سرسید کے رفقائے کار میں سے تھے اور سرسید احمد خان کے نظریات، فلسفہ اور اصلاحِ قوم کے جذبہ سے بہت متاثر تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری

اصطلاحی اور اخلاقی ہے۔ حالی ہی وہ شخصیت ہیں جو قوم کو خیال آرائی سے نکال کر حال کی دُنیا میں لائے۔ اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے اُردو غزل کو سچ کے زیور سے آراستہ کیا بلکہ جدید نظم کے لیے جدید راستے استوار کیے۔ حالؔی نے سرسیدؔ کی طرح یہ بھی دیکھا کہ لوگوں کی طرزِ فکر میں کون سی خوبی ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بادشاہوں کی خود مختار اور مطلق العنانی کے باعثِ عوام اپنی رائے قائم کرنے، اپنے بارے میں اچھا برا سوچنے اور اپنی مدد آپ کرنے جیسے بنیادی حقوق سے محروم ہوتے جارہے ہیں اور انہوں نے خود سوچنے سمجھنے کی بجائے اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم اور وقت کے بہاؤ پر چھوڑ دیا ہے۔ حالؔی نے غافل لوگوں کو کچھ کرنے کا درس دیا۔ مگر جو کچھ وہ چاہتے تھے کہ لوگ کریں یا تو اُن پر واضح نہیں تھا یا انگریز حکمرانوں کے ڈر کی وجہ سے واضح نہ کیا۔ حالی نے اگر انگریزی حکومت کی مداح سرائی کی ہے تو اُس کی مذمت بھی کی ہے۔

علم کیا ، اخلاق کیا ، ہتھیار کیا
سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ

مولانا الطاف حسین حالؔی نے مقدمہ شعر و شاعری کے آغاز پر ہی شاعری میں سماجی شعور کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالؔی نے فطری شاعری کو اپنایا اور یہ شاعری اِس لحاظ سے بھی انقلاب آفرین ہے کہ اِس سے قبل ایسی شاعری کا تصور بھی نہ تھا حالؔی نے اپنے اِردگرد جو مناظر دیکھے اُن کو اپنی شاعری میں سمویا۔ برکھا رُت کے چند اشعار:

؎ ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں
تیرا کیوں کے دِل بڑھے ہوئے ہیں

ہیں شکر گزار تیرے برسات

انسان سے لے کے تا جمادات

صرف یہی نہیں۔ حُبِّ وطن، رحم وانصاف، مناجات بیوہ اور چپ کی داد بلکہ مولانا حالؔی کی پوری شاعری کی زبان مخصوص، مہذب اور سنجیدہ ہے۔ بلکہ کلامِ حالؔی اس بات کا عکاس ہے کہ اچھی شاعری سادگی کے باوجود حسین اور پرکشش ہوسکتی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالؔی اِس لحاظ سے بھی منفرد ہیں کہ انہوں نے ہر نئی بات کہتے ہوئے بھی قدیم شعری روایات کو ہی اپنایا۔ انہوں نے شاعری کے قدیم سانچوں میں نظم اور مثنوی کے ساتھ ساتھ غزل کو بھی انقلابی انداز میں پیش کیا:

آ رہی ہے چاہ یوسف سے صدا

دوست یہاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

ناؤ ہے بوسیدہ اور موجیں ہیں سخت

اور دریا کا بہت چکلا ہے پاٹ

حالؔی کے دوسرے ہم عصر جنہوں نے جدید شاعری پر بہت کام کیا اور لیکچرز کے ذریعے روشناس کرایا وہ مولانا محمد حسین آزادؔ ہیں۔ اُردو شاعری اس لحاظ سے بھی محمد حسین آزادؔ کی احسان مند ہے کہ انہوں نے اپنی نئی تحریک کے ذریعے نہ صرف نئے خیال کو اجاگر کیا بلکہ اس رنگ برنگی جیتی جاگتی دُنیا کی خوبصورتی کو اِس شاعری کا حصہ بنانے کی گنجائش نکالی۔ انہوں نے اُردو کو خیالی بلند پروازی سے اتار کر اُس کے قدموں کو سوندھی مٹی سے مس کیا۔ مولانا محمد حسین آزادؔ سے قبل جو مناظر کبھی مثنویوں اور مرہٹوں کی کہانیوں میں محض کرداروں اور واقعات کے پس منظر کے طور پر دکھائے جاتے تھے۔ پہلی بار اپنی الگ شناخت کا پرچم لہراتے نظر آتے ہیں:

؎ وہ گہری سبزیوں میں گل تر کی لالیاں
اور اوس سے بھری ہوئی پھولوں کی پیالیاں

؎ وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا
اور جھوم جھوم کے وہ رخِ گل کو چومنا

مولانا محمد حسین آزاد کی نظموں میں شرافتِ حقیقی، صبح اُمید، وداع انصاف، شبِ قدر، خواب اور گنجِ قناعت وغیرہ مثنویاں ہیں اور مبارک باد جشن، ایک تارے کا عاشق اور ٹینی سن کی نظم کا آزاد منظوم ترجمہ قابلِ ذکر ہیں جس میں انہوں نے اپنے فن کے جوہر دکھاتے ہوئے اُردو نظم کے لیے نئے راستے اور زاویے متعین کیے۔ یقیناً مولانا محمد حسین آزاد کی یہ کاوش جدید اُردو شاعری میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

آزاد اور حالی کی نظم جدید سے متاثر ہونے والوں میں ایک اہم نام اسماعیل میرٹھی کا بھی ہے۔ جن کے کلام کی نمایاں خصوصیت سادگی اور سچائی ہے۔ اسماعیل میرٹھی نے زندگی کے واقعات کو اپنی شاعری میں یوں سمویا کہ اس کی منظر کشی کی نظیر نہیں ملتی۔ انہوں نے انگریزی نظموں کے ترجمے اس انداز سے کیے کہ وہ ہماری رہتل کی عکاس نظر آتی ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کی منظر نگاری قابلِ تعریف ہے۔ ایک نظم میں گھٹا کا ذکر اتنی اپنائیت سے کرتے ہیں کہ وہ چھتری بن کر ہمارے سر کو چھونے لگتی ہے اور اُڑتی ہوئی بھنبھیری ہماری ہتھیلی پر اُتر آتی ہے اور ہمارے بہت قریب آ کر گھٹا اور تتلیاں ہماری باتیں سنتی ہیں:

؎ گھٹا! کس سوچ میں چپکی کھڑی ہے
برس آخر تو ساون کی گھڑی ہے

بھنبھیری! اُڑ کر ساون آ گیا اب
گھٹا امڈی ہے بادل چھا گیا

اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضع ہوتی ہے کہ انہوں نے نہ صرف موسموں اور منظروں کو اپنے شعروں میں سمویا بلکہ انسانوں اور دوسرے جانداروں کے ساتھ ساتھ انسان اور انسانیت کی خدمت اور نسلِ انسانی سے محبت کے جذبات بھی ابھارے اُن کی شاعری اس بات کی عکاس ہے کہ انسان سے وابستہ ہر چیز سے اُنہیں پیار ہے۔ چاہے وہ پانی اور ہوا جیسے سائنسی موضوع ہی کیوں نہ ہوں۔ اسماعیل میرٹھی ایک کامیاب فطرت نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے مرقع نگار بھی ہیں۔ اُن کا مطالعہ گہرا ہے اور معلومات خاصی وسیع ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مشاہدے کی بنا پر ایک معمولی سی بات کے ذریعے گہرے گہرے احساسات اور اہم اہم جذبات کی نمائندگی کر جاتے ہیں۔ آج بھی اُن کی نظم ''اُٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں۔'' نہ صرف بچوں اور جوانوں بلکہ بوڑھوں کو بھی آنے والے لمحوں کے لیے اپنے آپ کو تیار و ہوشیار اور چاق و چوبند کر دیتی ہے۔ فطرت نگاری کے سلسلے میں کہی گئی نظموں کی نمایاں خصوصیات اِن کی سادگی اور روانی ہے۔ اِن کی نظموں کی تازگی اور شگفتگی سے جہاں سکون اور مسرت ملتی ہے وہاں ہر طرف اُمید کی کلیاں چٹکتی دکھائی دیتی ہیں۔

؎ بڑی دھوم سے آئی میری سواری
جہاں میں ہوا اب میرا حکم جاری
ستارے چھپے رات اندھیری سدھاری
دکھائی دیئے باغ اور کھیت، کیاری
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

اُردو شاعری میں بتدریج تبدیلی کی اس لہر میں ایک نمایاں مقام اکبر الہ آبادی کا ہے

جنہوں نے اُردو نظم کو نئے زاویے اور لہجے سے متعارف کروایا۔ انہوں نے سماج کا باریک بینی سے مطالعہ کیا اور زندگی کے تمام پہلوں پر تنقیدی نظر ڈالی اور پھر جو محسوس کیا اس کو مقصدی اور تعمیری پوشاک بخش دی۔ ان کے ملی و سیاسی نظریات ان کی شاعری سے واضح نظر آتے ہیں۔ اکبر نے مغربی تہذیب کو ہندوستانی معاشرے اور تہذیب کی شکست و ریخت کا ذمہ دار ٹھہرایا اور غیر ملکی سرکار کا ملازم ہونے کے باوجود انہوں نے اپنا مافی الضمیر بڑی جرأت سے بیان کیا۔ اکبرالہ آبادی کی نظموں میں اجتماعیت اور حقیقت نگاری کے عناصر کی فراوانی بعض اوقات علامتوں کی شکل اختیار کر جاتی ہے اور یہ علامتیں جدید دور کی عکاس ہیں۔ انجن، ہوٹل، بسکٹ، مشین، ریل، شیخ، کالج اور مس وغیرہ جیسے الفاظ اِن کی نظموں میں نئے طرزِ معاشرت اور طرزِ تہذیب کی بدولت فروغ پاتے ہیں۔ اکبرالہ آبادی وہ شاعر ہیں جنہوں نے اُردو نظم کو طنزیہ اور مزاحیہ اسلوب سے روشناس کرایا۔ اگرچہ حالی اور اکبر میں نظریاتی طور پر بہت بڑا بُعد تھا۔ مگر اِن دونوں نے جدید اُردو نظم کی بہت خدمت کی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق:

> دراصل حالی اور اکبر اپنے زمانے کے دو بڑے سورج تھے جن کے گرد کئی چھوٹے چھوٹے سیارے گردش کرتے رہتے تھے لیکن قوم کے اذہان کو منور کرنے کا مقصد اِن دونوں کے ہاں مشترک تھا۔

جدید اُردو نظم کی ترقی میں اہم کردار ادا کرنے والوں میں ایک نام ڈاکٹر علامہ اقبال کا ہے۔ انہوں نے اُردو نظم کو ایک مثالی انسان کا تصور دیا جو حرکت و حرارت کے عناصر اور فرد کی عظمت کا حامی تھا۔ اقبال نے ابتداء میں حالی اور شبلی کے رنگ میں نظمیں لکھیں اور ظفر علی خاں اور اکبرالہ آبادی کی طرح سیاسی، ہنگامی اور تہذیبی موضوعات کو قبول کیا۔

اقبال کی نظموں میں نکتہ نظر، فلسفہ، خطابت، اصولِ حیات اور ملی یکجہتی کے عناصر خوبصورت ترتیب کے ساتھ اجاگر ہوتے نظر آتے ہیں۔ یورپ میں قیام کے زمانے میں انہوں نے مغربی

تہذیب و سیاست اور معاشرت کے زوال کا بغور تجزیہ کیا جس کے نتیجے میں اُن کی شاعری میں عالمِ اسلام پر مغربی استعمار کے تسلط کے خلاف بھرپور ردعمل ظاہر ہوا۔ مسلمانوں کے ماضی اور حال میں اُنہیں ایسا تضاد نظر آیا جس کو دور کرنے کے لیے انہوں نے نفی خودی کی جگہ اثبات خودی پر زور دیا اور حرکت و عمل کے فلسفے کو اہمیت دی۔ اقبال یہ سمجھتے تھے کہ علم و ادب ہی وہ طاقت ہے جو انسان کی حدود متعین کرتی ہے۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو تعلیم اور خصوصاً اسلامی تعلیم کا درس دیا۔ اُن کی شاعری اس بات کی عکاس ہے کہ مسلم اُمہ کے تمام مسائل کی وجہ اسلام سے دوری ہے۔

اقبال نے اُردو نظم کو جو لہجہ اور احساس دیا وہ بعد میں آنے والے شعراء کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔ اقبال کی نظمیں لہجہ کی تازگی اور بھرپور شعریت کا شاہکار ہیں۔ شکوہ، جواب شکوہ، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، مسجدِ قرطبہ اور ساقی نامہ سے اُردو نظم میں نئے اور جاندار اسلوب کا آغاز ہوا۔ اقبال نے بھی پرانے نقطوں میں بڑے پیمانے پر تبدیلی کی اور اُردو نظم کو نئی علامتوں اور نئے موضوعات سے متعارف کروایا۔ اسلامی علامتیں، آفاقی علامتیں اور ذات کے انفرادی جبر کی علامتیں اقبال کی ہی تخلیق کردہ ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ ترقی پسند تحریک نے بھی اُردو نظم کو نیا رنگ دیا تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ ۱۹۳۶ء سے قیامِ پاکستان تک کئی نامور شعراء اس تحریک سے وابستہ رہے جن میں فیض احمد فیضؔ، جوش ملیح آبادیؔ، مجازؔ، احمد ندیم قاسمیؔ، علی سردار جعفریؔ، ساحر لدھیانویؔ، جان نثار اخترؔ اور کیفی اعظمیؔ قابلِ ذکر ہیں۔ احمد ندیم قاسمیؔ نے ترقی پسندانہ نظریات کے ساتھ ساتھ دیہاتی مناظر کی تصویر کشی اور طبقاتی کشمکش کو اجاگر کیا۔ اِسی طرح احسان دانشؔ وہ شاعر ہیں جن کی نظموں میں وطن سے محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجود ہے۔ انہوں نے پسماندہ طبقے کی بھی خوب ترجمانی کی ہے اور شاید اسی وجہ سے انہیں شاعرِ مزدور کا لقب دیا گیا ہے۔

اِس تحریک میں سب سے اہم شاعر فیض احمد فیضؔ ہیں۔ فیضؔ نے غزل اور نظم ہر دو میدان

میں اپنا مقام پیدا کیا۔ وہ اقبال کی طرح پیامی شاعر تھے۔ انہوں نے تشبیہ واستعارہ اور نغمگی جیسی فنی تدابیر کو اِس انداز سے استعمال کیا کہ اُن کی نظمیں دل کشی ورعنائی کا پیکر نظر آتی ہیں۔ جس طرح اقبال نے لفظوں کے معنی بدل دیے بالکل اسی طرح فیض نے بھی اپنا انوکھا اور اچھوتا اسلوب متعارف کروایا۔ محبوب، دارورسن، زندان جیسے الفاظ اپنے اندر وسعت کا ایک سمندر لیے ہوئے ہیں۔ فیضؔ وہ شخصیت ہیں جنھوں نے معاشرتی جبر، ترقی پسندانہ خیالات، فطری گہرائی اور استحصالی طاقتوں کے خلاف احتجاج کو اپنی نظموں میں متعارف کرایا۔ ''رقیب سے'' آج بازار میں پابہ جولاں چلو'' دِل من مسافر من'' اور ''تنہائی'' جیسی نظمیں اُن کی یادگار نظمیں ہیں۔

فیض کی شاعری میں کہیں حقیقت نگاری اور رومان کا ادغام ہوجاتا ہے اور کہیں اِن کی مزاحمت اور کشمکش کی صورت ابھرتی نظر آتی ہے۔ فیض کے لہجے کی انفرادیت اِن کی نظموں میں آویزش، ٹکراؤ یا سنگھم کی صورت کو متوازن بناتی ہے:

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ ست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینہ غمِ دِل

(صبح آزادی)

ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ حلقہ اربابِ ذوق نے بھی اُردو شاعری کو نئے اسلوب، رنگ، ضابطے، اور ذائقے سے روشناس کروایا۔ حلقہ کے اہم شعراء میں میراجیؔ کا نام سب سے اہم

ہے۔ اُس دور کی اُردو نظم میں موضوعاتی تنوع پیدا ہوگیا۔ طبقاتی ناہمواری، بے سکونی، حساسیت، تنہائی، جنس، خوف، اخلاقی روایات، قدروں کی شکست، فرد کی تنہائی اور انسان کی ناقدری کے موضوعات کو شاعری کا موضوع بنایا گیا۔ مغربی نظموں کے ترجموں کا رجحان پیدا ہوا، اور اب جنس اور مذہب جیسے حساس موضوعات پر بھی نظمیں لکھی جانے لگیں۔ میراجی کی نظم چنچل، جس میں ہندی الفاظ کے استعمال نے نظم کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا ہے:

؎ کبھی آپ ہنسے، کبھی نین ہنسیں، کبھی نین کے بیچ ہنسے کجرا
کبھی سارا سندر انگ ہنسے، کبھی رنگ رُکے ہنس دے گجرا

؎ یہ سندرتا ہے یا کو بتا میٹھی میٹھی مستی لائے
اس روپ کے ہنستے ساگر میں ڈگ مگ ڈولے من کا بجرا

؎ یہ موہن مدھ متوالی ہے، یہ مے خانے کی چنچل ہے
یہ روپ لٹاتی ہے سب میں، پر آدھے منہ پر آنچل ہے

؎ کیا ناز انوکھے اور نئے سیکھے اندر کی پریوں سے
اور ڈھنگ متوہر اور زہری سوچھے ساگر کی پریوں سے؟

؎ پہلے سینے میں آتی ہے پازیبوں کی جھنکاروں میں
آوارہ کر کے چین مرا چھپ جاتی ہے سیاروں میں

اسی دور کے ایک اہم شاعر اختر شیرانی ہیں۔ جنھوں نے جدید اور ترقی پسند شعرا کی کج روی کو نہیں اپنایا۔ اختر شیرانی وہ شاعر ہیں جنھوں نے نہ تو شاعری کی قدیم روایات سے بغاوت کی اور نہ

ہی فنی تقاضوں سے گریز کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دورِ جدید سے متاثر ہو کر اُس کا اثر بھی قبول کیا۔ انہوں نے اپنے کلام میں روایتی شاعری کے بے نام تصوراتی محبوب کی بجائے اُردو شاعری کو جیتے جاگتے محبوب سے روشناس کروایا اور اُسے گمنامی کے پردے سے نکالا اور ''عذرہ'' کہیں ''سلمیٰ'' اور کہیں ''ریحانہ'' کے نام سے مخاطب کیا۔

اختر شیرانی نے اپنی تمام شاعری میں اس روایت کو برقرار رکھا ہے۔ اُن کی نظمیں ''اے عشق کہیں لے چل''، ''او دیر سے آنے والے بتا''، ''آج کی رات'' اور ''انتظار'' اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ن م راشد نے اُردو نظم کے رائج الوقت اسلوب سے بغاوت کر دی۔ اُن کے تخلیقی ذہن نے اُردو کے مروّجہ سانچوں کو قبول کرنے کی بجائے اُنہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ اُن کا طرزِ احساس اُن کی نظموں کی ہیئت اور تکنیک اُردو قاری کے لیے ایک نئی اور انوکھی چیز تھی۔ اور اُسے گرفت میں لینا ہر کسی کے لیے آسان نہ تھا۔ راشد مغربی نظم نگاروں سے متاثر تھے، شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کی نظموں میں افسانوی اور ڈرامائی انداز نظر آتے ہیں۔ فرنگی سامراج سے دشمنی اور جنسیات راشد کے خاص موضوع ہیں۔ راشد کی شاعری میں فکری گہرائی بھی ہے اور اسلوب کی رعنائی بھی ہے۔ راشد کے عہد میں ایشیائی ممالک پر غیر ملکی طاقتوں کا تسلط تھا اِس لیے راشد اور اُس کے ہم عصر شعراء کے ہاں اِس غلبے کے خلاف احتجاج کا رنگ جھلکتا ہے مگر راشد نے اِس بغاوت کو استعاروں کی مدد سے یوں پیش کیا کہ اُسے آفاقیت حاصل ہوگئی۔ دُنیا کے ہر خطے کے لیے اور ہر دور میں غیر ملکی قبضے کی صورت میں راشد کی نظمیں جاندار اور متحرک نظر آتی ہیں۔ یہ رجحان ''ماورا'' کی چند آخری نظموں سے شروع ہوا اور ''ایران میں اجنبی'' میں شدت اختیار کر گیا۔ ''ماورا'' کی نظموں میں خاص طور پر انتقام، بے کراں رات کے سناٹے میں، شرابی، شاعر در ماندہ اور زنجیر اِس بغاوت کی مثالیں ہیں۔ زنجیر میں راشد بغاوت کی لہر سے غلامی کی زنجیر توڑ دینے پر ابھارتے نظر آتے ہیں۔

۱۹۶۰ء میں جدید شاعری کی تحریک

نئی شاعری کے آثار یا ابتدائی خاکہ ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ تیار ہونا شروع ہو گیا تھا تقسیم ہند کے بعد ملکی سیاسی حالت اور بین الاقوامی انتشار نے مل کر ایسا معاشرتی انسان تخلیق کیا جو بکھرا ہوا، کٹا پھٹا او رٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے اُس کی بنیادیں کمزور ہیں، مذہب، سیاست، نفسیات، اور فلسفہ کے نت نئے تصورات انسان کے احساس مرگ کو ختم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اُس دور کے فرد کو اپنی دُنیا دکھوں اور مصیبتوں سے بھری نظر آتی ہے اور اُسے اپنے نامکمل ہونے کا بھی شدید احساس ہوتا ہے۔ اُسے اپنی کوئی خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی اور اگر ملکی حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ نئے پاکستانی فرد کے بچپن کا زمانہ ہے، جہاں تقسیم کے دور کی افراتفری اور چار سو پھیلے خونی درندوں کی لمبی لال زبانیں دہشت پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اس دور میں ہر فرد کو احساسِ بیچارگی شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ اس دور کے شاعر نے اِن افراد کی آوازوں کو آزاد نظم میں منتقل کیا۔ یہ نظم تجرید، تلازمے اور تجسیم کا ملا جلا انداز ہے۔

نئی شاعری کی صورت میں ۱۹۶۰ء کے بعد موضوعات اور اسلوب دونوں سطحوں پر نمایاں تبدیلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کے زیرِ اثر کی جانے والی شاعری سے مختلف اور منفرد بھی۔ اس سلسلہ میں نئی شاعری کے علمبردار شعرا اپنے آپ کو مذکورہ دونوں بڑی ادبی تحریکوں سے الگ شمار کرتے ہیں اس ضمن میں انتظار حسین لکھتے ہیں:

> ''لکھنے والوں کی ایک نسل ختم ہو چکی ہے، اس کے جتنے امکانات تھے بس بروئے کار آ چکے ہیں۔ ادب کی تاریخ ان سے وابستہ نہیں۔ اس لیے ان کی خاموشی نہ تو ادب میں جمود کی وجہ قرار دی جا سکتی ہے اور نہ ان کی سرگرمی کو ادب کی زندگی سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ آج کے لوگوں میں نہیں۔ جس دور کے وہ لوگ ہیں اس دور کا ادب تخلیق کرنے کا نسخہ ہی آج بے کار ہے۔''(۲)

رد و قبول کے ادوار سے گزرنے کے بعد نئی شاعری کے لیے ادبی ماحول سازگار ہو گیا تو اس

تحریک سے وابستہ شعراء نے انحراف اور گریز کے باہمی اتصال سے ایسی شاعری کی جو جدیدیت کے رائج تصورات سے مختلف نہیں تو منفرد ضرور تھی۔ انہوں نے اسلوب اور موضوع کی نئی تعبیر سے مقررہ نظریوں اور فارمولوں کو رد کیا اور اپنے تجربے اور حواس کی بنیاد پر زندگی کو پرکھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے جدیدیت کے تاریخی تصور کی بجائے خالصتاً ادبی و فکری شعری روایت کو قائم کیا۔ نئی شاعری کی اساس پرانی نظم کے تکرار یا اعادے کی بجائے نئے تخلیقی اصولوں پر رکھی گئی اور تخلیق کا سرچشمہ شاعر کے باطنی وجود سے پھوٹنے لگا۔ اس امر پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جیلانی کامران لکھتے ہیں:

> نئی نظم کی اساس تجربے پر ہے اور اس لحاظ سے منفرد ہے کیونکہ اس کا تجربہ اپنی پیدائش کے اعتبار سے وسیع فکری منطقوں سے تعلق رکھتا ہے اور رونمائی کے اعتبار سے ایک ہی وقت میں مختلف زاویوں سے اپنی شباہت کو پیدا کرتا ہے۔ (۳)

نئی شاعری سے وابستہ شعراء نے بنے بنائے پیمانوں، نظریات، جماعتی وابستگی اور اجتماعی تحریکوں کو نظر انداز کیا اور انسان کے ذاتی المیے اور کرب کو موضوع بحث بنایا۔ مغرب کی سائنس اور صنعتی تہذیب نے ہماری قدروں کو بھی متاثر کیا اور شخصی طرزِ احساس کو نمایاں کر کے طے شدہ موضوعات اور فنی اسالیب سے انحراف کے رویے کو جنم دیا۔ اس کے نتیجے میں شاعری کو لمحہ موجود سے ہم آہنگ ہو کر تجربے کی اساس پر دیکھا اور دکھایا گیا۔ نئی شاعری اپنے قاری سے برابر کی سطح پر مقالہ کرتی ہے وہ ذاتی تجربے اور ذاتی علامتوں کو سامنے لے کر شخصی طرزِ احساس کو نمایاں کرتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قاری تخلیقی شعور کو نہ صرف سمجھنے کے قابل ہو بلکہ باقاعدہ طور پر شاعر کے ساتھ ذہنی، جذباتی اور تجرباتی سطح پر بھی ہم آہنگ ہو۔ اِسی صورت میں نئی شاعری پر ابہام کا الزام رد کیا جا سکتا ہے۔ گویا نئی شاعری کے حامی اظہار و ابلاغ کے حوالے سے قاری اور شاعر کے فکری میلانات، اسلوب اور لفظیات کے آپس میں ہم آہنگ ہونے پر زور دیتے ہیں لیکن انتہا پسندانہ تخلیقی رویہ جو لسانی تشکیلات کی صورت میں سامنے آیا اس نے شاعر اور قاری کے درمیان عدم ابلاغ کی فضا کو پیدا کر دیا۔

۱۹۶۵ء کی لسانی تشکیلات کی تحریک

نئی لسانی تشکیلات کے نمایاں شعراء نے نظم میں علامت، مثال، تلازمے اور استعارے کو ذاتی اور انفرادی سطح پر برتنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے ابلاغ کے سلسلے میں نہ صرف عام قاری بلکہ شاعروں کو بھی مختلف مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ لسانی تشکیلات کے ضمن میں افتخار جالب اور انیس ناگی وغیرہ ابلاغ کو اضافی مسئلہ قرار دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کی انتہا پسندی سے کام لیا گیا اُس سے نئی شاعری کا ابلاغ مجروح ہوا ہے۔ لسانی تشکیلات کے حوالے سے افتخار جالب نے الفاظ کو اشیاء کی نمائندگی کی بجائے اشیاء قرار دے کر استعارہ در استعارہ کی صورت میں ایسی زبان تخلیق کی ہے جس نے نئی شاعری میں ابہام کی مختلف صورتیں پیدا کر دی ہیں۔ اِن مختلف صورتوں کے پیش نظر سلیم احمد نے نئی شاعری کو نامعقول شاعری قرار دیتے ہوئے درج ذیل وجوہات کی نشان دہی کی ہے:

> (i) نئی شاعری اختصاصی فن ہے۔ لہٰذا عوام کی بجائے خواص کا فن ہے۔ (ii) نئی شاعری میں جانا پہچانا انسان غائب ہے۔ (iii) ابلاغ نئی شاعری کا مسئلہ نہیں ہے۔ (iv) یہ شاعری پرانی شاعری کی روایت سے انحراف یا بغاوت کے طور پر پیدا ہوئی ہے۔ (v) نئی شاعری میں علامات، ذاتی سمبل، امیجز، صوتی آہنگ کا استعمال اور تشبیہ استعارے کی زبان پرانی شاعری کے مقابلے میں اتنی بدلی ہوئی ہے کہ ایک نئی دُنیا معلوم ہوتی ہے۔ (۴)

نئی شاعری اپنے اسلوب، طرزِ احساس اور ذاتی علامتوں کی وجہ سے پیچیدہ اور مبہم ہے کیونکہ اس سے متعلق شعراء نے خوابوں اور خواہشوں کی نفسیاتی اور لاشعوری تصویر کشی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لسانی تشکیلات کے زیرِ اثر نظم اور غزل کے روائتی اسالیب اور موضوعات کو توڑا گیا اور ہیئت اور مواد دونوں میں

اجتہاد سے کام لیا گیا۔ ہیئت کی صورت میں نثری نظم جیسی صنف سامنے آئی جبکہ مواد کی پیشکش میں ذاتی اور نفسیاتی تجربات کو بیان کرنے کی روش کو اپنایا گیا۔ لسانی تشکیلات سے وابستہ شعرا نے مروجہ اصناف اور موضوعات کے خلاف بغاوت کی بقول مخدوم منور:

> آج کے صنعتی اور مشینی عہد میں بدلتی ہوئی قدروں اور سچائیوں کی دوڑ میں قدم بہ قدم چلنے کی صلاحیت اور جاگیرداری عہد کی جمالیات سے بغاوت ہی نثری نظم کی پہلی نشاندہی ہے۔ نثری نظم اپنے ساتھ نئے نئے الفاظ اور نیا پیٹرن لائی ہے اور یہ ذہنی اور جذباتی آزادی کے ساتھ ایک نئی آزادی کی فضا میں نئے آرٹ کا ظہور ہے۔ (۵)

نئی شاعری کے اکثر شعراء نے نئی لسانی تشکیلات کے ساتھ ساتھ نثری نظم کو وسیلہ اظہار بنایا ہے جو اس بات کی غماز ہے کہ یہ روایت اور شاعری کی مروجہ کلاسیکی اصناف سے ایک واضح انحراف کی صورت ہے بقول ڈاکٹر اصغر علی بلوچ:

> یہ صنف مجموعی نظریاتی پس منظر نہ ہونے کے باوجود ایک تحریک کی صورت میں سامنے آئی ہے اور جدیدیت مابعد جدیدیت اور وجودیت جیسی فکری تحریکوں سے متاثر ہوئی ہے۔ (۶)

مندرجہ بالا فکری تحریکوں کی بدولت ہی تشدد، بے رحمی اور انسان دشمنی جیسی منفی قدروں کا تخلیقی شعور شاعری میں شدت کے ساتھ ابھرا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انفرادی آزادی، معاشرتی اقدار کی پاسداری، انسانی اقدار اور انسان دوستی کی صورت میں مختلف موضوعات نے اُردو شاعری کے دامن کو وسیع کیا ہے۔ جدید شاعروں نے مادے سے رُوح تک، راست بیانیے سے استعاراتی اظہار تک، پابند نظم سے نثری نظم تک اور غزل سے آزاد غزل تک کا سفر طے کیا ہے اور زندگی کی پیچیدہ اور گنجلک صورتوں کو پیچیدہ اور مبہم پیرائے میں سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

مراتب اختر کی شاعری میں بھی اِن مختلف اسالیب اور موضوعات کی رنگارنگی نظر آتی ہے۔ غزل میں انگریزی اور مقامی لفظیات، محاکات نگاری اور نظم میں جدید تر اسلوب اس بات کا شاہد ہے کہ انہوں نے معاصر ادب سے اثر پذیری کے بعد اپنا منفرد لہجہ بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مراتب اختر اور معاصر غزل

مراتب اختر کا شمار ساٹھ کی دہائی میں سامنے آنے والے غزل گو شعراء کی فہرست میں شامل ہے۔ اِس دہائی میں اپنا ادبی مقام مستحکم بنانے والے دیگر شعرا میں جون ایلیا، شکیب جلالی، اقبال ساجد، انور شعور، سلیم شاہد، ناصر شہزاد، ریاض مجید، صلاح الدین محمود، اختر احسن، ثروت حسین، جاوید شاہین، ناصر کاظمی اور احمد مشتاق کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔

جون ایلیا

جون ایلیا اپنے لب و لہجے اور اسلوب کی بنیاد پر انفرادیت کا حامل شاعر ہے۔ اُن کی شاعری میں کلاسیکی رویوں کے ساتھ ساتھ موضوعاتی تنوّع اور غزل کا تہذیبی رچاؤ اُنھیں قابلِ ذِکر شعراء کی صف میں نمایاں مقام کا حامل بناتا ہے۔ اُنہیں غزل کے مروّجہ اور روایتی مضامین کی پیشکش پر دسترس حاصل تھی۔ وہ مختلف شعری تراکیب کے تخلیقی تفکر سے رُونما ہونے والے حالات اور احساسات سے وابستہ رہ کر کشتِ غزل کی آبیاری کرتے رہے۔ جون ایلیا کی غزل گوئی کی انفرادی جہات کو زیرِ بحث لاتے ہوئے ڈاکٹر طارق ہاشمی رقم طراز ہیں:

> اُردو غزل میں تیکھے تیوروں کا اسلوب کوئی نیا تجربہ نہیں لیکن جون نے اس سلسلے میں کچھ ایسی لفظیات کا اہتمام کیا ہے کہ اُسے اُردو غزل کی طنزیہ روایت کی تقلیدِ محض نہیں کہا جا سکتا۔ (۷)

جون ایلیا صحیح معنوں میں ماہرِ لسانیات تھے اور اُردو زبان کی مروّجہ لفظیات کے ساتھ ساتھ لفظ سازی کے ہنر سے بھی آگاہ تھے۔ وہ غیر مانوس الفاظ کو بھی اس طرح استعمال میں لاتے کہ وہ غزل میں کھردرے پن کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ مثلاً جدید صنعتی زندگی اور جدید انسان کو علامتی انداز میں پیش کرنے والی اُن کی یہ غزل ملاحظہ ہو:

یاد آئی ہے کوئی آس مشین
شام سے ہے بہت اُداس مشین
دل وہی کس مشین سے چاہے
ہے مشینوں سے بد حواس مشین
یہی رِشتوں کا کار خانہ ہے
اِک مشین اور اُس کے پاس مشین
ایک پرزہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا
اب رکھا ہے کیا ترے پاس مشین (۸)

جون ایلیا کے کلام میں متروک لفظوں کے احیاء کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے نامانوس الفاظ اور مرکبات کا استعمال اُن کی انفرادیت اور لسانی تشکیلات میں دلچسپی کو ظاہر کرتا ہے۔

انور شعور

انور شعور، شعورِ ذات کا شاعر ہے وہ اپنی ذات کی دریافت میں مگن ہے کیونکہ دورِ حاضر کا بنیادی مسئلہ ہی انسان کی تلاش ہے۔ انور شعور فلسفہ حیات وممات کی جستجو میں ہے اور فرد کے باطن کو حسی سطح پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر طارق ہاشمی:

> اپنی ذات کو محور و مرکز بنا کر اس طرح اشعار تراشنا کہ ایک نقطہ پھیلتے پھیلتے مکان کی وسعتوں اور زماں کی گردشوں کو ہی نہ سمیٹ لے بلکہ کوزہ گر ازل کے چاک کا بھی احاطہ کرے۔ اُردو غزل میں یگانہ اسلوب ہے۔ (۹)

انور شعور نے واحد متکلم میں اپنا ذات نامہ تشکیل دینے کی کوشش کی ہے جو اُسے اپنے باطن کی کھوج جیسے متصوفانہ رجحان کی جانب مائل کرتی ہے۔ بقول محمد سلیم الرحمٰن:

> باطن کے اِس کھوج کو انور شعور نے اپنی غزلوں کا اوّل و آخر قرار دیا ہے۔ (۱۰)

انور شعور کے ہاں رومان کی شدت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ شعریت کے گہرے تاثر

کو قاری تک منتقل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔اس کا ثبوت اُن کی غزل کے یہ چند اشعار ہیں:

اس میں کیا شک ہے کہ آوارہ ہوں میں
کوچے کوچے میں پھرا کرتا ہوں میں
مجھ سے سرزد ہوتے رہتے ہیں گناہ
آدمی ہوں ، کیوں کہوں اچھا ہوں میں
صاف و شفاف آسمان کو دیکھ کر
گندی گندی گالیاں بکتا ہوں میں
کانچ سی گڑیوں کے نرم اعصاب پر
صورتِ سنگ ہوس پڑتا ہوں میں
خواب آور گولیوں کے راستے
خودکشی کی کوششیں کرتا ہوں میں (۱۱)

اختر احسن

ساٹھ کی دہائی میں روایت سے انحراف کی اہم مثال اختر احسن ہیں انھوں نے ''زین غزلوں'' کی صورت میں بدھ مت سے فکری روابط کی داخلی شہادت دی ہے۔''زین غزلیں'' ان کے مجموعے ''گیانگر میں لنکا'' میں شائع ہوئی ہیں جن کی تعداد ۱۰۰ ہے اور دو ابواب میں برابر تقسیم کی گئی ہیں۔ پہلے باب کا عنوان ''گوتم'' اور دوسرے کا ''راون'' دیا گیا ہے۔

''زین غزلوں'' میں گوتم کا گیانگر اور راون کا لنکا دو متضاد تہذیبی علامتیں ہیں۔ اِن غزلوں کے توسط سے اختر احسنؔ نے عالمی جنگی وحشت کو بیان کیا ہے جس میں غالب اقوام کو محکوم اقوام کا استحصال کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ گوتم اور راون کے اساطیری کرداروں اور علامتوں کے پس منظر میں ''زین غزلیں'' اُردو غزل کے تجرباتی سفر میں انفرادی شناخت کی حامل ہیں۔ اُن کی غزلوں کے

چند شعر درج ذیل ہیں:

باب دوم ''گوتم''

کرنے آئے تھے سیر بدھ جی
دریا کو گئے ہیں پیر بدھ جی

اللہ اللہ تمہارے دم سے
تم ہی ہو حرم اور دیر بدھ جی

نروان تو مِل گیا صاحب
ہم کو نہ ملے تو خیر بدھ جی

باب دوم ''راون''

جب راون نے بندوق چلائی
چیخن لاگی ساری خدائی

گرجے کال ہے سب کے سر پر
کال سمے ہے کال بھلائی

گلے میں کرموں کی ہے مالا
کالی چولی سادھو بھائی (۱۲)

جاوید شاہین

جاوید شاہین کا شمار غزل کے نمایاں شعراء میں ہوتا ہے، اُنھوں نے کسی خاص نظریے کو باقاعدہ اپنانے کی بجائے اپنی انفرادی تخلیقی فعالیت کو برقرار رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایک طرف تو غزل کو نظم میں سمونے کی کوشش کی ہے اور دوسری طرف نثری نظم کی صورت میں مروّجہ اصناف

سے انحراف کا ثبوت دیا ہے۔ بقول انیس ناگی:

جاوید شاہین کا ابتدائی کلام غزل کی کلاسیکی میں لکھا گیا ہے اور موضوعاتی سطح پر بھی اپنی عاشقانہ حرماں نصیبی کو معروضی سے علائق سے ملانے کا رجحان بھی ہے۔ (۱۳)

جاوید شاہین نے نامانوس الفاظ کو اس مانوس ڈھنگ میں برتا ہے کہ اُن سے اُن کی شخصی آزادی کے احساس کے ساتھ ساتھ اُن کی انفرادیت بھی جھلکتی ہے۔ جاوید شاہین نے بدلتی ہوئی دُنیا اور پیچیدہ نظامِ زندگی کو غزل کی روایت میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ایک نئے جہانِ فن کا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ نئے سانچے، نئی تراکیب اور نیا طرزِ اظہار اُنھیں اپنے معاصرین میں نمایاں مقام پر متمکن کرتا ہے۔ اُن کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

جو برف زار چیر دے ایسی کرن بھی لا
پتھر دِلوں میں آج کوئی کوہ کن بھی لا

اس طرح سرسری میرا بابِ وفا نہ لکھ
وقتِ شمارِ زخم مرا خستہ تن بھی لا

یہ چشمِ التفات ہی کافی نہیں مجھے
میرے لیے تو نرمی کام و دہن بھی لا

زخمِ سفر کے دردِ مسلسل کا سحر توڑ
نکلا ہوا وطن سے غریب الوطن بھی لا

شاہینؔ اسے عزیز ہے اپنا لہو تو کیا
نعشِ شہید کے لیے خونیں کفن بھی لا (۱۴)

ثروت حسین

ساٹھ اور ستر کی دہائی میں نمایاں ہونے والے شعرا میں ثروت حسین کی غزل بقول سراج

منیر ''اِس پوری نسل کے شعری تجربے کے عین مرکز میں واقع ہے۔''(۱۵)

اُن کی غزل میں مذہبی طرزِ احساس کے ساتھ ساتھ تاریخی علامتیں اور کردار بھی پائے جاتے ہیں لیکن اُن کی جذباتی وابستگی کرۂ خاک سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاک اُن کا مستقل استعارہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

نقش کچھ اُبھارے ہیں فرشِ خاک پر میں نے
نہر اک نکالی ہے وقت کاٹ کر میں نے

وہ اپنی مٹی کی شادابی اور ہریالی کے خواب دیکھتے ہیں اور اُن کی تعبیر کے لیے دُعا گو رہتے ہیں۔

آئے ہیں رنگ بحالی پر
رکھتا ہوں قدم ہریالی پر

ثروت حسین کے ہاں اساطیری علامتوں اور کرداروں کا متحرک منظر نامہ بھی تشکیل پاتا ہے۔ شہزادی کا کردار اُن کا محبوب کردار ہے۔ اِس کے علاوہ شہرزاد، بلقیس، صوفیا اور سلیمان کے کردار بھی اُن کی غزل کی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ پنجاب اور سندھ کے صوفیاء کرام کی کافیوں اور منظوم لوک داستانوں کے رنگ بھی اُن کی شاعری میں پھیلے ہوئے ہیں۔

لال لہو فوارہ ہو
یار نے خنجر مارا ہو
سچا سائیں منارے والا
تن من تجھ پر وارا ہو

مجموعی طور پر ثروت حسین کی شاعری کی علامتیں اپنی سرزمین کے تہذیبی اور رُوحانی دھاروں سے جڑی ہوئی ہیں۔ اِن کے علاوہ ساٹھ کی دہائی میں خورشید رضوی، توصیف تبسم، ریاض مجید، زہرہ نگاہ اور کشور ناہید وغیرہ بھی قابلِ ذِکر نام ہیں جن کا شمار مراتب اختر کے ہم عصر شعراء اور شاعرات میں ہوتا ہے۔

مراتب اختر اور معاصر نظم

۶۰ کی دہائی میں اُردو نظم کو واضح اور منفرد صورت عطا کرنے والے شعرا میں جیلانی کامران، افتخار جالب، انیس ناگی، عباس اطہر، زاہد ڈار، تبسم کاشمیری، گوہر نوشاہی اور مراتب اختر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ مراتب اختر، مجید امجد کے قریبی دوستوں میں سے تھے، اور شاعری کے حوالے سے ان کے نظریات اور اسلوب بھی مجید امجد سے متاثر ہونے کی نشاندہی کرتا ہے، مراتب اختر کی نظم پر بات کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ معاصر نظم کے شعرا میں سے چند کا اجمالی خاکہ پیش کیا جائے، تاکہ اس وقت کے حالات و واقعات، علمی ادبی فضا اور ماحول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، ہم عصر نظم گو شعرا میں مراتب اختر کا مقام و مرتبہ متعین کرنے میں آسانی ہو۔

افتخار جالب

افتخار جالب کی نظمیں بظاہر مفہوم سے معرا اور نظم کی جدید روایت سے بالکل مختلف ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ خیال کے لامحدود موضوع سمیٹے ہوئے ہیں۔ افتخار جالب نے اپنی نظموں میں نئے عہد کے انسانی مسائل کی پیچیدگیوں کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ افتخار جالب نے ماضی اور ماضی کی تمام روایات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے، اپنے دور کے مسائل کی نشاندہی کی ہے، افتخار جالب کی نظموں کے طریقۂ کار پر رائے دیتے ہوئے سیّد سجاد لکھتے ہیں:

> شاعر کا میتھڈ بہت اہم ہے کہیں بھی صرف علامت، تلازمے اور تجرید پر انحصار نہیں کیا گیا۔ ان سب چیزوں کو کہیں تو اکٹھا اور کہیں زورِ بازو کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ نظم ایک نقطہ سے شروع ہوتی ہے اور فکری تسلسل کے ساتھ چلتی ہے اور پھر دو تین مصرعوں میں ہی تلازمہ نئی دُنیاؤں اور تصویروں میں لے جاتا ہے۔ اس تلازمے میں تصویریں محض تصویریں نہیں رہتی، علامتیں بھی بنتی ہیں، پھر وہ یہ علامتیں، علامتوں

سے اُبھر کر تجریدی عمل میں مصروف نظر آتی ہیں، تجریدی عمل دوبارہ اس مقام پر لے آتا ہے، حتیٰ کہ نظم کے بنیادی خیال کی ہر ذہنی سطح سے شناسائی ہو جاتی ہے۔ (۱۶)

افتخار جالب کی نظمیں تیسری دُنیا کے انسان کے مسائل اور مشکلات کی آئینہ دار ہیں انھوں نے ٹریفک کے ہنگاموں، اقتصادی اور معاشی مسائل، کھیتوں میں غلہ بانوں کی پریشانیوں اور کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی گزارتے انسانوں کی عکاسی اور ترجمانی بہت خوبصورت انداز میں کی ہے، ان کی ایک نظم نمونے کے طور پر پیش ہے۔

''ہوا آئے گی
بہر نیلگوں کے سرد سینے پر شکستہ رنگ ذروں کو
قیامت تک لیے پھرتی رہے گی اور طلعت کی بھری آغوش میں آخر
ظہورِ آدمِ خاکی مجھے تنہائی بخشے گا
میں حیراں کوچہ جاناں کی رعنائی کو دیکھوں گا
بدن بے حرکتی میں منجمد اندھے تصوّر کی دل آویزی کی حد سے ماورا
وصلِ دوعالم میں بسا احساس کی شرمندگی کی دھوپ میں
محبوب کے شیریں
عدمِ رفتہ
نجانے تن کو چھو کر کھول جائے گا
جسے زندانِ ہستی میں تلاش و جستجو کے بعد وہ وہم و گماں پایاں
بالآخر خیمہ شب میں اسی کی ذات سے شیر و شکر ہونے کی لذت حشر تک
مصروف رکھے گی''

افتخار جالب کی نظموں میں نئی تراکیب و احساسات کے ساتھ ساتھ لسانی تشکیلات کے بھی عمدہ نمونے نظر آتے ہیں جو اس عہد میں نئی نظم کے میدان میں جوہر دکھانے والوں کے ہاں کثرت سے موجود ہیں۔ افتخار جالب اپنے دور کے نمائندہ شاعروں میں سے ایک ہیں۔

عباس اطہر

عباس اطہر نئی نظم کے نمائندہ شاعروں میں اہم مقام کے حامل ہیں۔ ان کی نظموں کا بنیادی استعارہ جنس ہے، وہ نئے سائنسی معاشرے کے انتشار کی بڑے جرأت مندانہ طریقے سے عکاسی کرتے ہیں۔ ماحول اور تجربے کی نوعیت کے مطابق ان کی لفظی تصویریں متحرک، منجمد، روشن، تاریک، رنگین اور بے رنگ ہوتی ہیں اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ وہ ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جہاں کوئی چیز بھی ٹھکانے پر نہیں۔ اس معاشرے میں تازی گھوڑا پالان کے نیچے مجروح ہو رہا ہے اور گدھے کی گردن میں طوقِ زریں ڈالی گئی ہے۔ ایک ہی خاندان کے افراد بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں۔ ملوں اور فیکٹریوں میں مزدور کا استحصال جاری ہے۔ سڑکوں پر کالے دھوئیں کے بادل پھیل رہے ہیں۔ ایسے آلودہ ماحول میں انسان کی سوچیں بھی آلودہ ہوتی جا رہی ہیں۔ اس لیے عباس اطہر نے معاشی پسماندگی اور معاشرتی ناہمواری کے تضاد پر بات کی ہے۔ ان کے کردار فکری، تہذیبی اور معاشرتی بے راہ روی کے آئینہ دار ہیں۔ لہو پینے والی پہاڑیاں، قتل، خوف اور تشدد بھی ان کی علامتیں ہیں۔ ان کے کردار آج کے مشینی دور کے وہ کردار ہیں جو ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہونے کی بجائے اپنے مسائل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان کے کرداروں میں رُسوائی، برہنگی، موت، انتقام، تلخی، تشویش اور شکستگی کا احساس بڑا شدید ہے۔ عباس اطہر کی شاعری کے خدوخال ان سطور میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

''اس نے دروازے کی درزوں سے
سرکاری جیپ کو سات رنگوں کے راستے پر پھسلتے سنا
سانسوں میں شکار
غار میں چھپ جانے والے کے واقعے پر دراڑ
جب وہ سات سو سال باہر نکلا
پرانے سِکّے بدل چکے تھے

کیک، پیسٹریوں، نوٹوں اور اٹھنیوں پر نئے کتے کی تصویر تھی''

عباس اطہر وہ شاعر ہیں جن کے لاشعور میں شہنشاہیت سے لے کر بربریت تک کے سیکڑوں تصورات پوشیدہ ہیں۔ بادشاہ کی سواری، مکڑی کے جالے، موت کا وحشی ناچ، ننگے سر لٹکتی بادشاہ کی لاش، شہادت کا ثمر، یہ سب کچھ ہمارا قدیم اثاثہ اور معاشرتی ماحول کا حصہ ہے۔ عباس اطہر نے اس اثاثے کی پیش کش کو نئے عہد کے رجحانات اور رویوں کی صورت میں اپنی شاعری میں سمویا ہے۔

مجید امجد

جدید اُردو شاعری میں مجید امجد کا نام انفرادیت کا حامل ہے۔ مجید امجد کی ابتدائی شاعری اُردو نظم کی رومانی تحریک سے متاثر ہے۔ مگر ان کی نظمیں رُومانی شعرا کی نظموں کی نسبت زیادہ منجھی ہوئی اور مزین ہیں۔

''شبِ رفتہ'' میں ''دمِ شرر'' کے حصے کی سب نظمیں رومانی شعرا کے اثر کا ہی نتیجہ نظر آتی ہیں مگر ان کی نظمیں انفرادیت، مخصوص تمثال نگاری اور آہنگ کی مناسبت کی خصوصیات کی وجہ سے انفرادیت کی حامل ہیں۔ امجد کی نظموں میں حال سے بے اطمینانی کا احساس تو موجود ہے مگر اس میں شدت نہیں۔ مجید امجد کا واسطہ زندگی میں جن مسائل، اُلجھنوں اور داستانوں سے پڑا وہ ان کی شاعری پر اثر انداز ہوئیں۔ امجد نے اپنی نظموں میں نئے عہد کی صنعتی زندگی کے ساتھ اُبھرنے والے نئے شہروں کے جغرافیے سے لے کر پرانی قصباتی تہذیب کی متوازن قدر کو سمویا ہے۔

نئے صنعتی شہر آباد ہونے سے آبادی میں اضافہ ہوتا ہے اور بڑھتی ہوئی آبادی کی رہائشی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بنائے جانے والے مکانوں اور بنگلوں کی تعمیر کے لیے درختوں کو کلہاڑیوں سے کاٹ دیا جاتا ہے۔ سائنس اور مادہ پرستی کے اس دور میں اداروں، تنظیموں اور دفتری زندگی کی مصروفیات میں پھنسے انسان نے ایک مشین کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مجید امجد اپنی نظموں میں نئی شہری زندگی اور پرانی قصباتی فضا کو اُبھارتے ہیں:

وہ چھپر اچھے ہیں جن میں ہوں دل سے دل کی باتیں
ان بنگلوں سے جن میں بسیں ، گونگے دن بہری راتیں
چھت پر بارش بھیگے اُجلے کالر ، گدلی انتڑیاں
ہنستے مُکھ ، ڈکراتی قدریں ، بھوکی مایا کے سب مان

مجید امجد کی نظم کنواں ''شبِ رفتہ'' کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ کنواں زندگی کی ایسی علامت ہے جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک قائم رہے گی ان کے خیال میں زندگی امکانات کے ہیر پھیر کا نام ہے اور انسان کسی بھی لمحے نئے اور عجیب منظر کے سامنے کھڑا ہو سکتا ہے۔ ''طلوعِ فرض'' معاشرے میں زندگی کے کاروبار پر روشنی ڈالتی ہے اور معاشرتی طبقے کو اُجاگر کرتی ہے۔ شہر کی مشینی زندگی سے اُکتاہٹ بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مجید امجد کی نظموں میں زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور مسائل کو بہت خوبصورت انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔

مجید امجد اپنی نظموں میں لفظوں کی ایسی تصویریں کھینچتے ہیں جو ذہنی، بصری اور محسوساتی ہوتی ہیں۔ ان کی نظموں میں زندگی کی گہما گہمی اور رونقوں کے علاوہ محرومی اشیاء کا وافر ذخیرہ بھی موجود ہے۔ ان کی تمثالیں بڑی ملائم، اُجلی، نفیس اور متوازن ہوتی ہیں۔ لفظوں کے استعمال میں وہ کلاسیکی رویہ اپناتے نظر آتے ہیں۔ جذبات و احساسات کے پھیلاؤ کو مضبوط بنانے کے لیے وہ متوازن اور متناسب الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں ان کی نظموں کے مصرعوں میں خاص قسم کا ربط، تسلسل اور روانی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ''آٹو گراف'' ان کے فنی ارتقاع میں کلیدی حیثیت کی حامل ہے۔ اِس میں انھوں نے لفظوں کے صوتی تلازمات کا بہت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ پھاٹک، شخصیت، کھلاڑی اور باؤلر جیسے غیر شعوری لفظ مجید امجد کی قادرالکلامی کے سبب شعری اظہار کا بہترین نمونہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ بلاشبہ مجید امجد اپنے عہد کے شاعروں میں ایک معروف نام کے حامل ہیں۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ ''مجید امجد نے خارج کی مادی دُنیا کو باطن کی غیر مادی دُنیا سے مربوط

کرنے میں فنی بالیدگی کا ثبوت دیا ہے۔''(۱۷)

انیس ناگی

انیس ناگی جدید اُردو نظم کے شعرا میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں ان کا شعری مجموعہ ''بشارت کی رات'' ایسی نظموں پر مشتمل ہے جس میں تشکیک، تجسّس اور معاشرتی صورتِ حال کی بے یقینی واضح نظر آتی ہے۔ ناگی کی نظموں میں اشیاء کی شکست وریخت اور ٹوٹ پھوٹ کا احساس عمومی ہے۔ انھوں نے انسانوں کو محسوس کیا اور ان کے لاغر ڈھانچوں اور بیمار حسن کی تصویر کشی کی۔ وہ تمدن کی نئی ترتیب کے خواہش مند ہیں۔ انیس ناگی کے ہاں ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جو جلاوطن فرد کی سرگزشت سنائی دیتی ہیں۔ ایسا جلاوطن فرد جس کا ماضی اِس کے لیے بے فائدہ ہو اور حال میں بے اطمینانی اور مستقبل کا بھی کوئی واضح تصوّر نہ ہو۔

''کس جہنم کا ہم آج ایندھن بنے ہیں
جو جلتا نہیں اور بجھتا نہیں
ہاں یہ تابوت اُٹھتا نہیں ہے
یہ کیسی ہوا ہے
جو جلتی نہیں اور تھمتی نہیں
جسم پر کتنی لاسیں پڑی ہیں
جنھیں دیکھ کر کوئی ہنستا نہیں اور روتا نہیں؟
سانس ڈھلتی نہیں
زندگی ہاتھ آتی نہیں''

انیس ناگی کی نظموں میں گھسے پٹے مصرعوں اور جملوں کی بجائے نئے الفاظ ملتے ہیں انھوں نے نئی گرامر اور نئی شعری ضروریات کے مطابق عروضی وزن میں ترمیم وتبدیلی سے بھی گریز نہیں کیا۔

سلیم الرحمٰن

سلیم الرحمٰن جدید اُردو نظم کے نمائندہ شاعر ہیں ان کے ہاں شخصی ذات کے حوالے سے

انسانیت کی جو تصویر تشکیل پاتی ہے اس میں دُکھ، کربِ مسلسل، تشدد، دہشت اور جنوں واضح نظر آتے ہیں۔ انھیں اپنا مقدر فنا کی تصویروں میں نظر آتا ہے۔ وہ جذباتیت سے زیادہ سفاکی کے رویوں کو اپناتے ہیں۔

''رات کو اس گھر کا دروازہ کھلتا ہے
لمبے لمبے ناخنوں والی چڑیل
نکلتی ہے
جو چیخ چیخ کر ہنستی ہے
اور میری جانب بڑھتی ہے''

(خوف)

سلیم الرحمٰن سلجھی ہوئی اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی علامتیں اور اِستعارے مِل کر ان کی شاعری میں بڑی علامت کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ سلیم الرحمٰن نے سادہ بحور استعمال کی ہیں اور قلیل الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی دینے کی کوشش کی ہے۔

زاہد ڈار

زاہد ڈار جدید دور کے نظم گو شعرا میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں ان کی شاعری میں میرا جی کے لہجے کا واضح عکس نظر آتا ہے۔ ان کی نظموں کی زبان بے تکلّفانہ اور روزمرہ بول چال کے قریب ہے۔ ان کی شاعری میں جدید عہد کا آشوب اور نئے انسان کا انتشار گڈمڈ ہو کر سامنے آتے ہی۔ انھوں نے ماحول کی بے ہنگم اور بے معنی زندگی کا مشاہدہ بھی تفصیلی انداز سے کیا ہے۔ زاہد ڈار کی شاعری میں مادی اشیاء کے ٹھوس حسی تصورات کے ساتھ ساتھ ان اشیاء کے ردِّعمل کے طور پر اُبھرنے والے تجربہ کی کیفیات کی بھی فراوانی ہے۔

''ہر رُوپ کی بے نام تنہائی میں اُترا کیا

اجنبیت، راستے، دریا، اندھیری رات، تارے
پھر اندھیری رات، تارے
پھر نہیں سورج نہیں
ہم نے یوں
اِک اندھیری رات میں چھوڑا مجھے'' (اندھیری

رات)

زاہد ڈار کی تمثیلیں کبھی موسموں سے تو کبھی عام انسانی زندگی کے کاروبار اور کبھی تصوراتی دُنیا کے پُراسرار جزیروں سے ترتیب پاتی ہیں۔ بلاشبہ زاہد ڈار کا کلام جدید اُردو نظم میں ایک شاندار اضافہ ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

تبسم کاشمیری کی نظموں میں اِردگرد کے پھیلے مناظر کی تصویر نظر آتی ہے۔ انھوں نے معاشرتی زبوں حالی کا انفرادی سطح پر تجزیہ بھی کیا ہے اور مجموعی صورتِ حال کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں پیلے پھول، بنجر شاخیں، لڑھکتے پتھر، جنگل کی آوازیں، سیاہی اور خون نظر آتے ہیں۔ تبسم کاشمیری کی شاعری میں خوبصورت اور نئے تراکیب بھی استعمال ہوتی ہیں۔ انھوں نے معاشرتی ماحول کی بے رغبتی اور لامعنویت کو بھی محسوس کیا ہے۔

''بوڑھے پنشنر کا فیلٹ پھٹ چکا تھا شاید ثابت دنوں کا غم تھا
گونگے گھنٹیاں بجا رہے تھے اور بہرے گھنٹیاں سن رہے تھے
اور اندھوں کے ہاتھ میں مشعلیں تھیں
ان کے دماغوں میں کیچڑ بھر دی گئی تھی اور خون میں کھارا پانی''

حوالہ جات

۱۔ الطاف حسین حالؔی، دیباچہ نظم حالی، کلیاتِ نظم حالی، حصہ اول، ص ۳

۲۔ انتظار حسین، نئی نسل کے خلاف ردِ عمل، مشمولہ: ہمایوں، جولائی ۱۹۵۳ء، ص ۲۷

۳۔ جیلانی کامرانی، نئی نظم کے تقاضے، لاہور: کتابیات، اشاعت دوم، ۱۹۶۷ء، ص ۲۶

۴۔ سلیم احمد، نئی شاعری نامعقول شاعری، کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۹ء، ص

۵۔ مخدوم منور، نثری نظم کی تحریک، ملتان: کاروانِ ادب، اشاعت دوم، ۱۹۸۲ء، ص ۱۱۲

۶۔ اصغر علی بلوچ، ڈاکٹر، فلسفہ اخلاق اور بیسوی صدی کی اُردو نظم (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی) لاہور: مخذونہ لائبریری اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۹، ص ۴۶۶

۷۔ طارق ہاشمی، ڈاکٹر، اُردو غزل ـــــ نئی تشکیل، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۸ء، ص ۴۰۳

۸۔ جون ایلیا، شاید، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۲۸

۹۔ طارق ہاشمی، ڈاکٹر، اُردو غزل ـــــ نئی تشکیل، ص ۲۱۱

۱۰۔ محمد سلیم الرحمٰن، تعارف اور شور، مشمولہ: آٹھ غزل گو، مرتبہ: جاوید شاہین، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۶

۱۱۔ انور شعور، مشقِ سخن، کراچی: ڈائیلاگ پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص ۵۷

۱۲۔ اختر حسن، گیا نگر میں لنکا، لاہور: تخلیقات پبلشرز، س۔ن

۱۳۔ انیس ناگی، پاکستانی اُردو ادب کی تاریخ، لاہور: جمالیات، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۲

۱۴۔ جاوید شاہین، آٹھ غزل گو، ص ۶۷

۱۵۔ سراج منیر، وہ خواب ہے اور کہیں کا، مشمولہ: ادبیات، شمارہ ۳۶، اسلام آباد: ص ۱۶۱

۱۶۔ سیّد سجاد، نئی نظمیں، لاہور: نئی مطبوعات، ۱۹۶۷ء، دیباچہ

۱۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا مزاج، ص ۳۹۴

باب پنجم

مراتب اختر کی غزل گوئی

مراتب اختر کی غزل گوئی

ساٹھ کی دہائی میں شہرت حاصل کرنے والے شعراء میں ایک اہم نام مراتب اختر کا بھی ہے۔ مراتب اختر منفرد لہجے کے جدید شاعر تھے۔ جنھوں نے غزل میں نئے نئے تجربات کیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعری کی اساس اسلوب ہے اور اسلوب کی خوبصورتی الفاظ کے انتخاب کی مرہونِ منت ہے۔ لفظوں کا خوبصورت انتخاب کلام میں آہنگ اور موسیقیت پیدا کرتا ہے اور الفاظ کی لطافت، فصاحت اور موزونیت ایک دوسرے کے ساتھ تقابل کے بعد واضح ہوتی ہے۔ مراتب اختر اُردو غزل میں جدیدیت کے علم برداروں میں اہم مقام رکھتے ہیں اور اُن کا اسلوب اس کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں جدید لفظیات کو استعمال کر کے جدید غزل کو ایک نیا رنگ دیا۔ مراتب اختر کی شاعری کے حوالے سے معروف شاعر اور نقاد افتخار جالبؔ لکھتے ہیں:

> مراتب اختر نے جو شاعری کی ہے۔ اس میں رکھ رکھاؤ، ڈِکشن کی ملائمت، نفاست اور مروّجہ شعریت نہیں ہے۔ سب کچھ اُکھڑا اُکھڑا دکھائی دیتا ہے۔ یہ خرابیاں کہ امکان سے نابلد، اندھے اور بے مغز لوگوں کو گراں گزرتی ہیں۔ درحقیقت مراتب اختر کی خالص خوبیاں ہیں۔ (۱)

مراتب اختر شاعری کے میدان میں لکیر کے فقیر ثابت نہ ہوئے بلکہ انھوں نے عرصہ دراز سے استعمال ہونے والے سادہ الفاظ کو اس نئے رنگ سے اپنی شاعری میں استعمال کیا کہ وہ اُن کی پہچان بن گئے۔ مراتب اختر کے حوالے سے وحید اطہر اپنے مضمون ''مراتب اختر اور ہم'' میں یوں رقم طراز ہیں:

> مراتب اختر کے ہاں گل و بلبل کی شاعری نہیں ہے۔ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ رہا۔ اس نے دیومالائی قصے کہانیوں کا سہارا نہیں لیا۔ وہ جیتے جاگتے ماحول میں زندہ رہا۔ داخلی

جذبوں کے ساتھ ساتھ، خارجی حقیقتوں کا اظہار مراتب اختر کی غزلوں کا خاصا ہے۔ (۲)

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ شاعری جذبات واحساسات اور داخلی وخارجی کیفیات کے اظہار کا نام ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر عمر کے شاعر کا مشاہدہ کرنے اور بیان کرنے کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ نہ تو کسی شاعر کا محض اسلوب اُس کی شاعری میں جان ڈال سکتا ہے اور نہ ہی اکیلے موضوعات اُس کی شہرت کا سبب بن سکتے ہیں بلکہ اِن دونوں خوبیوں کا امتزاج عظیم ادب کی تخلیق کا سبب بنتا ہے۔ مراتب اختر کی غزلوں کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے رومانی، معاشرتی، سیاسی، نفسیاتی، مذہبی موضوعات کے ساتھ تصوف، دیہی زندگی کی پیشکش، عصری مسائل اور فکری اور جذباتی کشمکش کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ مراتب اختر کا تعلق ایک صوفی گھرانے سے تھا۔ وہ ایک باعمل اور درویش منش انسان تھے۔ خود بھی ہر وقت حمد وثنا میں مصروف رہتے تھے اور مریدین کو بھی اس کا درس دیتے تھے۔ اُن کے کلام میں بھی جگہ جگہ حمدیہ اشعار ملتے ہیں بلکہ ان کی کتاب ''گنجِ گفتار'' کے شروع کے صفحات میں ان کا حمدیہ کلام بھی شائع کیا گیا ہے۔

صدیاں اُس کی حمد زمانے اُس کی ثناء
جس کو اَن دیکھا انجانا مان لیا

یوں تو ان کے کلام میں بے شمار حمدیہ اشعار موجود ہیں مگر اُن کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

قیودِ روز و شب سے ماورا ہے
خدا نام و نسب سے ماورا ہے

آفاق میں طاقت کا محور، بن دیکھے اُس کو مان لیا
سمٹے تو جلال پہاڑوں کا، پھیلے تو سمٹ کر رائی ہے

تیری جمالیات زمانوں پہ ہے محیط
میرے تحیّرات کا مصدر وجود میں

ڈھونڈتا پھرتا ہوں دُنیا میں جسے دیکھا نہیں
جو ازل سے پاس ہے اور سامنے آیا نہیں

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان کے ساتھ ساتھ نبیٔ اکرم ﷺ سے عقیدت ہر مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے:

ذکر خدا کرے ،ذکرِ مصطفیٰ نہ کرے
میرے منہ میں ہو ایسی زباں خدا نہ کرے

اس شعر کے مصداق مراتب اختر نے بھی رسولؐ اللہ کی مدح سرائی کی ہے اور نبیٔ کریم ﷺ کی شان میں کئی نعتیہ اشعار لکھے ہیں جن میں سے چند بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

اُس کے بغیر کس کو مِلا ہے جہان میں
معراج کا مقام؟ محمد کہیں جسے

اے وجہِ کل ، متاعِ ازل ، سیّدالبشر
اب تجھ کو لاج مجھ کو ہے تیرا کہا گیا

اللہ کا مِلا ہے پتہ تیرے نام سے
ہر راز زندگی کا کھلا تیرے نام سے

خود دیکھتا ہوں کھلتے ہوئے رحمتوں کے در
کرتا ہوں جب شروع دُعا تیرے نام سے

شق ہو گیا قمر کبھی سورج پلٹ پڑا
یہ واقعات جو نہیں آتے شعور میں!؟

ہر مردِ کامل اور راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح مراتب اختر بھی خدا اور رسول ﷺ سے محبت کے بعد عقیدہ آخرت پر کامل یقین رکھتے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

پیکر سے خاک جھاڑ کے دوڑوں گا تیری سمت
گھنٹی جوں ہی بجے گی ابد کے سکول کی

زندگی اور موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہر ذِی رُوح کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب انسان کائنات میں آتا ہے تو اس کی سانسیں، رزق اور زندگی کے معاملات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور بظاہر ہر آنے والے دِن زندگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے لیکن حقیقت میں لکھی گئی زندگی میں بتدریج کمی ہو رہی ہوتی ہے۔ مراتب اختر نے اس حقیقت کو کتنے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہی۔ وہ لکھتے ہیں:

دِل دھڑکتے ہیں، کہ دن جھڑتے ہیں پت جھڑ کی طرح
عمر سانسوں کی گلوں کی زدِ ایّام میں ہے

اسی بات کو ایک دوسرے شعر میں بیان کرتے ہیں:

دن بدن گھٹ رہے ہیں عمر کے دن
چڑھ کے دریا اُتر رہا ہے کوئی

کائنات میں پیدائش و اموات کا سلسلہ ازل سے جاری ہے اور تا ابد قائم رہے گا۔ اس زندگی کی ناپائیداری پانی کے بلبلے کی طرح ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جیسے

سرسبز وشاداب درخت کے تمام پتوں کا مقدر ایک ایک کر کے گرنا ہے اور پھر درخت کو نئے سرے سے سرسبز وشاداب ہونا ہے۔ بالکل اسی طرح کائنات میں آنے والے ہر انسان نے باری باری اپنے انجام کو لوٹنا ہے اور پھر قیامت کے بعد اس جہان نے نئے سرے سے آباد ہونا ہے۔ دُنیا کی اس بے ثباتی کے حوالہ سے مراتب اختؔر یہ لکھتے ہیں:

اِک وہ دن بھی زندگی میں آئے گا
ایک پتہ ٹوٹ کر گر جائے گا

بے ثباتی کی اسی حقیقت کو وہ ایک اور شعر میں یوں بیان کرتے ہیں:

ہر ایک چیز لوٹ رہی ہے اُسی کی سمت
مبداء ہے ایک عرصہ گہے ممکنات کا

شاعر معاشرے کا حساس طبقہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے دور میں ہونے والے ظلم وزیادتی اور سماجی رویوں کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہی اُنھیں معاشرے کی آنکھ کہا گیا ہے۔ ہر معاشرے میں اچھے اور بُرے کی تمیز بھی ہوتی ہے اور ریاکاری اور ایثار جیسے رویوں کو بھی محسوس کیا جاتا ہے۔ مطلب پرستی اور خودغرضی ایسے ہتھیار ہیں جنھیں بعض عیار اور مکار لوگ موقع کی مناسبت سے استعمال کر کے اپنا کام نکالتے اور راستہ ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مراتب اختر کو اس سماجی رویے کا بخوبی ادراک تھا۔ وہ کہتے ہیں:

مطلب پڑے تو کہتا ہے تم بھی عظیم ہو
یہ کیسا ڈھنگ یاد ہے موقع شناس کو

ایسا معاشرہ جس میں اسلامی نظام رائج نہ ہو اور اسلامی تعلیمات کو خاطر خواہ اہمیت نہ دی جائے وہاں انسان کا استحصال ہوتا رہتا ہے۔ انسانوں کو کبھی مستقبل کے سہانے خواب دِکھا کر لوٹا جاتا ہے تو کبھی آنے والے انقلاب کی جھلک دکھا کر لیکن اس سودی نظام میں غریب، غریب تر ہوتا جاتا ہے اور سرمایہ دار

اور اہلِ اقتدار طبقہ آسودہ حال ہوتا جاتا ہے۔حساس دل کے مالک مراتب اختؔر نے انسانوں پر ہونے والے اس ظلم کو نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ اس کا اظہار بھی کیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

نہ چاند رات کے لمحے نہ جگنوؤں کے دیے
کسی نے مجھ کو گھنے سائے ظلمتوں کے دیے

علم معاشیات کا ایک قانون اس بات کو واضح کرتا ہے کہ جہاں طلب پیدا ہو وہاں رسد بڑھ جاتی ہے لیکن حقیقی معاشرے میں اس کا ثبوت بہت کم ملتا ہے۔ظلم و زیادتی، جبر و ناانصافی، سازش اور اقربا پروری جس معاشرے کے ناسور ہوں وہاں اصل حق داروں اور سائلوں کے حقوق حذف ہوتے رہتے ہیں۔مغربی جمہوریت کے زیرِ اہتمام پروان چڑھنے والے اس معاشرے میں جہاں پسند اور ناپسند کو معیار مانا جاتا ہے وہاں سہولیات اور وسائل کی فراہمی کے لیے بھی جاگیرداروں اور وڈیروں کی ترجیحات کو مقدم رکھا جاتا ہے۔مراتب اختر نے اس معاشرتی ناہمواری کو محسوس کرنے کے بعد یوں بیان کیا ہے:

وہ شہر روشنیوں کی جسے ضرورت تھی
رہا ہے اُس کی حدوں سے پرے پرے سورج

۱۹۴۷ء میں ہمیں ملنے والی آزادی ایک تاریخی حقیقت ہے مگر مغربی نظام کے اثرات کی وجہ سے رویوں میں بڑی تبدیلی نظر نہیں آتی۔مراتب اختر جیسے جدیدیت پسند شاعر نے اس المیے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

اذہان آج بھی ہیں ، روایت کی قید میں
ہم کر دیئے گئے ہیں، رہا مانتے نہیں

معاشی مسائل کی اُلجھنوں میں پھنسے انسان کی سوچیں رزق کی تلاش کے گرد گھومتی ہیں اور وہ خدا کو بھول کر دُنیاوی مسائل میں اُلجھا ہوا ہے۔مراتب اختر جیسا درویش منش شاعر اس رویے کو

محسوس کرتے ہوئے اس طرح لکھتا ہے:

اب آدمی کی حس پر مسلط مشین ہے
اب زر کی جستجو ہے ، خدا پھر کبھی سہی

اچھی شاعری کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ اُسے ہر دور کا قاری یہ سمجھ کر پڑھتا ہے کہ اِس میں اُس کے دِلی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے اور اچھے شاعر کا کلام ایسی داستان ہوتا ہے جس میں قاری کو اپنی کہانی جھلکتی نظر آتی ہے۔ اچھا شعر ہر دور میں ہر ماحول میں اور ہر وقت میں نیا معلوم ہوتا ہے۔ مراتب اختر نے یہ شعر شاید اُس وقت کی ترجمانی کے لیے لکھا تھا مگر آج محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے آج کے عہد کے حکمرانوں کو مخاطب کر کے بات کی گئی ہے۔

ناسمجھ اس سرزمین پر آنے والوں کے لیے
کچھ نئے بحران بوتے جا رہے ہیں دوستو!

ایک اچھا مصور اپنی بنائی تصویر میں زندگی کے تمام رنگ بکھیرتا ہے تو ایک اچھا شاعر تمام موضوعات کو اپنی شاعری میں سموتا ہے اور تمام مسائل کی نشان دہی کرتا ہے۔ مسئلہ کشمیر و فلسطین مسلم اُمہ کے دیرینہ مسائل ہیں جہاں لاکھوں فرزندانِ اسلام جامِ شہادت نوش کر چکے ہیں مگر تا حال آزادی کی راہ دیکھنے والے فلسطینی اور کشمیری اس محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ مراتب اختر نے نہ صرف اس دیرینہ مسئلہ کو محسوس کیا بلکہ اپنی شاعری میں اس کا ذِکر بھی کیا بلکہ ان کا یہ شعر ان کے سیاسی شعور، انسانی ہمدردی، جنگ کے خلاف اور امن کے حامی ہونے کی دلیل ہے۔

چاروں طرف ہے خون کا دریا چڑھا ہوا
کشمیر ، سر زمینِ مقدس ، رڈیشیا

ہیروشیما اور ناگاساکی پر ہونے والے ایٹمی حملوں نے جہاں پوری دُنیا کو ہلا کر رکھ دیا وہاں شاعر اور ادیب بھی اس سے متاثر ہوئے۔ مراتب اختر جیسے حساس اور دردمند دِل رکھنے والے شخص کا

متاثر ہونا لازمی اَمر تھا۔اس حوالہ سے مراتب اختر کا یہ شعر قابلِ ذِکر ہے۔

اِک روز ویٹ نام، سرامن آئے گا
اے تابکار گھومنے والے ہواؤں میں

اس دُنیا کے ہر معاشرے میں انسان مختلف رشتوں میں گِھرا ہوا ہے۔ بظاہر نسبی اور خونی رشتوں کو ہی رِشتوں کے مطلب میں لیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں رشتے صرف احساس کے ہوتے ہیں اگر احساس ہو تو سب رشتوں کی قدر اور اہمیت ہوتی ہے اور اگر احساس نہ رہے تو خونی رشتے بھی بے معنی ثابت ہوتے ہیں۔احساس سے عاری انسان کے لیے رشتے کوئی معانی نہیں رکھتے وہ اپنی خود غرضیت میں اس حد تک مگن ہوتا ہے کہ اُسے حالات کی تلخی، آزمائشِ وقت اور بشری تقاضوں کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ایسے نیم مردہ ضمیر کے حامِل انسان کے سامنے کوئی ظلم ہو تو وہ آنکھیں موند لیتا ہے، مراتب اختر نے اس المیہ کو دیکھا اور اس درد کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔اس شعر میں وہ اس بے مروّتی کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

لوگ لٹتے رہے سرِ بازار
تیر تلتے رہے کمانوں میں

ہمارا معاشرہ انگریز حکمرانوں سے آزادی کے بعد آزاد نہیں ہو سکا اور ہم اب بھی اسی نظام میں جکڑے ہوئے ہیں۔انگریزوں کے عطا کردہ دفتری نظام میں کلرک آج بھی بااختیار نظر آتے ہیں اور آج بھی غریب، مجبور اور سیدھے سادھے لوگوں کے لیے دفتروں میں جگہ جگہ رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔جائز کام کروانے کے لیے بھی رشوت اور سفارش جیسی لعنتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ دفتروں کے چکر لگا لگا کر بھی اپنا حق حاصل کرنے میں ناکام ہوتے ہیں۔مراتب اختر نے اس انسانی المیے کو شدت سے محسوس کیا ہے وہ اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

میں فائلوں کے ایک پلندے میں بند تھا

دفتر کی اِک دراز کے اندر بکھر گیا

مراتب اختر نے رومان کو جو ماضی بعید سے اُردو شاعری اور خاص طور پر غزل کا اہم موضوع رہا ہے۔ اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ رومان اصل میں ایک ایسے جذبے کا نام ہے جس کے بغیر انسانی زندگی نامکمل نظر آتی ہے۔ جنس مخالف میں رکھی جانے والی کشش ہی مقصدِ بقائے حیات معلوم ہوتی ہے۔ رومانی شاعر جب عشقیہ موضوعات پر طبع آزمائی کرتے ہیں تو جنس مخالف کے حسن و جمال کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ مراتب اختر کے کلام کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ جنسِ مخالف کے جمال سے تو زیادہ متاثر نہیں ہوئے لیکن عشق و محبت کی داستان کئی اشعار میں عیاں ہوتی ہے۔ وہ ایک خوبصورت ملاقات کا ذِکر اس انداز سے کرتے ہیں۔

یاد ہے آج بھی وہ رات، وہ خلوت، وہ ترا
تھام کر ہاتھ مرا پیار سے کہنا بیٹھو

محبوب کی قربت عاشق کا سب سے قیمتی اثاثہ اور سرمایہ ہوتا ہے۔ قربت میسر ہو تو داستانِ رومانیت خود بخود عیاں ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ محبوب کے ساتھ گزرے لمحے اور بیتے پل ہمیشہ کے لیے یادگار بن جاتے ہیں۔ وہ جگہیں، مقام اور راستے معتبر ہو جاتے ہیں جن پر کبھی محبوب کے ہمراہ چلنے کی سعادت حاصل ہوئی ہو اور جب کبھی حالات ناموافق ہو جائیں، دُوریاں مقدر بن جائیں اور ملاقاتیں ناممکن ہو جائیں تو عاشق کے لیے یہ مناظر اور یادیں اور بھی قیمتی ہو جاتی ہیں۔

آ ان کے سبز سایوں میں کچھ دیر بیٹھ لیں
ان جھاڑیوں سے اپنی کبھی رسم و راہ تھی

ساون کے مہینے میں ہونے والی بارشوں اور مست گھٹاؤں سے ماحول میں نشے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور محبت کرنے والوں کے لیے تو یہ مہینہ ہمیشہ پُرکشش رہا ہے۔ ایسے سہانے موسم سے لطف اندوز ہونے کی خواہش عاشق اور محبوب دونوں کے دِلوں میں ہمیشہ اور یکساں ہوتی ہے

مگر اس طرح کے مواقع ہمیشہ میسر نہیں آتے کیونکہ زندگی کے بعد موت اور ملنے کے بعد جدائی تو ازل سے ہی انسان کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے اور جدائی کے موسم میں دل کی حالت پہلی سی نہیں رہتی آہستہ آہستہ بے قراری کی بجائے ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ جدائی کے یہ زخم بھرنے شروع ہو جاتے ہیں اور پھر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب یہ سارے واقعات، یادیں اور لمحات سکرین کے پردے سے ہٹ جاتے ہیں اور کچھ یاد نہیں رہتا۔

اب مجھ کو بھول بھال گئے سب معاشقے
ساون کی رُت گزر گئی ، دریا اُتر گئے

بلاشبہ وقت کی دھول بعض واقعات اور یادوں کو آہستہ آہستہ ذہن سے نکال دیتی ہے اور یادوں سے وہ منظر غائب ہو جاتے ہیں مگر کچھ واقعات اس طرح کے بھی ہوتے ہیں جنھیں بھلانا چاہیں بھی تو بھی نہیں بھلا پاتے اور یاد نہ بھی کریں تو بار بار یادوں کے کواڑ کھٹکھٹاتے رہتے ہیں۔ کچھ ایسی یادیں ہوتی ہیں جنھیں فراموش کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ محبوب کی قربتوں کا سحر لیے یہ یادیں بھلانا ممکن نہیں ہوتا۔ مراتب اختر اس منظر کو یوں بیان کرتے ہیں:

وہ ممٹیوں کی منڈیریں، وہ رات کے سائے
نہ بھول پاؤں گا میں جن کو عمر بھر پیارے

محبت کرنے والوں کے درمیان غلط فہمیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اور لڑائی جھگڑے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ عاشق زمانہ بھر کے جبر اور ظلم کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتا ہے اور ہر طرف سے ہونے والی پتھروں کی بارش کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے مگر محبوب کی جانب سے پھینکا گیا پھول اس کے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے اور محبت میں تو کوئی دلیل، کوئی وضاحت قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ وصل پیار کرنے والوں کی زندگی کو باغ و بہار بنا دیتا ہے اور جدائی خزاں ثابت ہوتی ہے۔ قربت تو محبوب بھی چاہتا ہے اور عاشق سے ملنے کی خواہش تو اسے بھی ہوتی ہے مگر بعض مجبوریوں کی بنا پر قریب ہوتے

ہوئے بھی ملنے سے اجتناب کرتا ہے اور یہ اجتناب عاشق کو ناگوار گزرتا ہے اور یہ ناراضگی تو ایک قدرتی اَمر ہے۔ محبوب وقت ملنے پر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے لاکھ دلیلیں دے، منانے کی کوشش کرے مگر عاشق کی جو کیفیت ہوتی ہے مراتب اختر اس کو بڑے دِل سوز انداز میں پیش کرتے ہے:

اب دلیلوں سے مرے دُکھ کا مداوا نہ کرو
رُک گئے تھے تو مرے پاس بھی آئے ہوتے

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ دو چاہنے والے جب ملتے ہیں تو بہت سارے گلے شکوے بھی کرنا چاہتے ہیں اور محبت کا اظہار بھی، اپنی پریشانیوں سے دوسرے کو آگاہ کرتے ہیں تو دوسرے کی کیفیات کو بھی محسوس کرنا ہوتا ہے، مگر بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ جونہی گفتگو کا آغاز کیا حالات یکدم ناموافق ہو گئے اور نہ چاہتے ہوئے بھی جدا ہونا پڑا۔ ایسے حالات میں دل کی تمام باتیں دل میں رہ جاتی ہیں۔ اس کیفیت کو مراتب اختر نے بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اِک آہ بھر کے ہو گئیں پرچھائیاں جدا
دونوں کے لب پہ آئی ہوئی بات رہ گئی

اس معاشرے میں ہمیشہ ظلم کو دبایا گیا ہے اور حقیقت سے آنکھیں چرائی جاتی رہی ہیں۔ مظلوم کی سسکیوں اور آہوں کو بلند ہونے سے روکا گیا ہے۔ غالب نے ہمیشہ مغلوب کا استحصال کیا ہے اور آزادیٔ اظہار پر ہمیشہ قدغن لگائی ہے۔ ان تمام پابندیوں اور قیود کو ایک عام آدمی کے لیے بھی برداشت کرنا مشکل ہے اور ایک شاعر وہ بھی مراتب اختر جیسا ایسے ماحول میں کیا خاموش رہ سکتا ہے۔ اس حوالے سے ان کا یہ شعر ایک بہترین مثال ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ بات کو مفہوم ملے
ان کی یہ ضد ہے کوئی بات نمایاں نہ کرو

تیسری دُنیا کے لوگوں کی قسمت میں شاید اچھے دنوں کے خواب آنکھوں میں بسائے ہی

زندگی کا دریا عبور کرنا لکھ دیا گیا ہے۔ حکمران اور برسرِ اقتدار زندگیاں بدلنے اور نظام میں بہتری لانے کے وعدے تو بہت کرتے ہیں مگر اس سودی نظامِ زر کے تحت امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ مراتب اختر نے اس رویے کو شدت سے محسوس کیا ہے اور وہ اربابِ اختیار سے پوچھتے ہیں کہ آپ کے کیے ہوئے وعدے کیوں وفا نہیں ہوتے۔ وہ لفظوں کے ایسے طنزیہ نشتر استعمال کرتے ہیں کہ محسوس کرنے والے ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

ترس رہا ہے میرا شہر چند بوندوں کو
مجھے بتاؤ کہاں؟ بادلوں کے سائے ہیں

ایک بہترین شاعر اپنے اردگرد کے ماحول پر گہری نظر رکھتا ہے۔ لوگوں کے رویوں سے متاثر ہوتا ہے اور پھر اپنے تاثرات کو لفظوں کی صورت میں اشعار کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ رشوت ایک ایسا ناسور ہے جو بتدریج بڑھتی ہے اور رشوت خور چھوٹے درجے کے ملازم ہونے کے باوجود خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ کوٹھی، کار اور بہترین لباس ان کے خوشحال ہونے کا ثبوت ہے جب کہ ایمانداری سے روزی کمانے والے اور ایمانداری سے فرائضِ منصبی سرانجام دینے والے افسران اپنی سفید پوشی کا بھرم بھی قائم نہیں رکھ پاتے۔ معاشرے کے اس غلط رویے کی مراتب اختر نے شدید الفاظ میں مذمت کی ہے اور رشوت خوروں پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے:

اِک کھوکھلے غرور سے جل تھل ہے گفتگو
رشوت کی اِک سڑاند ہے خوش پوش ماس میں

اُردو زبان فارسی سے بہت زیادہ متاثر ہوئی اور فارسی کی بہت ساری خصوصیات اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ فارسی غزل کی ایک خصوصیت اضافتوں کا استعمال ہے۔ اُردو غزل میں اضافتوں کے استعمال کا سلسلہ ۶۰ء کی دہائی کے شعراء میں بھی موجود ہے۔ اضافتوں والی تراکیب کے ساتھ ساتھ بغیر اضافتوں کے تراکیب کا سلسلہ بھی اس عہد کی غزل میں واضح نظر آتا ہے جس میں شعری ضرورت کے تحت شاعر نے اضافت بھی استعمال کی ہے مگر جس خوش اسلوبی اور فنی مہارت کے ساتھ

بغیر اضافت والی تراکیب کو آگے بڑھایا ہے، یہ اسی دور کا خاصہ ہے۔ مراتب اختر نے بھی ان تراکیب کا بہت خوبصورت انداز میں استعمال کیا ہے۔ اس کی مثال یہ اشعار ہیں:

کبھی کھو دیتا ہوں تجھ کو کبھی پالیتا ہوں
میرا دل خانۂ گل ہے کبھی ویرانہ ہے

میرا وجود رونق صد حجلۂ دوام
اے دوست بے ثباتی دُنیا نہیں ہوں میں

کیوں قدسیوں کے سجدے ہیں تیرے طواف میں
اے سینۂ بشر کے حرم ، کچھ خبر نہیں
یہ احتمال تھا پہلے سے فرقِ ناز مجھے
کڑکتی دھوپ میں تجھ کو برہنہ پاؤں گا

لے کر جلو میں تابش نغمات آ گیا
آنکھوں کی بستیوں میں وہ کل رات آ گیا

کشمیر وادیٔ جنت نظیر برصغیر کے مسلمانوں کا ایک دیرینہ مسئلہ ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جس طرح ہندوؤں نے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کیا اور رائے عامہ کی پرواہ کیے بغیر اسے اپنا اٹوٹ انگ قرار دیا اس سے مسلمانوں کے جذبات بُری طرح مجروح ہوئے۔ کشمیر میں ہونے والی قتل و غارت اور ظلم و ستم کی داستانیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مسلمانوں سے ہونے والے اس ظلم و زیادتی پر جہاں عالمی امن کے ٹھیکے دار خاموش ہیں وہاں ہمارے اپنے بھی بیان بازی کی حد تک اپنے کشمیری بھائیوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ مراتب اختر اس صورتِ حال کو یوں بیان کرتے ہیں:

بنتِ کشمیر کی روتی ہوئی آواز سنو!
اِک خبر بیچنے بازار میں ہاکر نکلے

یہ بات درست ہے کہ کم لفظوں میں بڑے موضوع کو سمیٹنا ایک بہترین شعری خوبی ہے اور اس خوبی کا وجود بہت کم شاعروں کی شاعری میں ملتا ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض مواقع پر تکرارِ لفظی شعر کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ مراتب اختر کی غزل میں بھی بہت سے ایسے اشعار موجود ہیں جن میں تکرارِ لفظی پائی جاتی ہے اور یہ تکرار ایک مصرعہ میں ایک برس سے لے کر کئی مقامات اور لفظوں تک پھیلی نظر آتی ہے۔ یہ تکرارِ لفظی مصرعوں کے آغاز تک ہی محدود نہیں بلکہ آغاز کے ساتھ مصرعہ میں کہیں بھی ایک سے زیادہ الفاظ کی تکرار رہی ہے، جو معیوب نہیں لگتی بلکہ موسیقیت میں اضافے کا سبب محسوس ہوتی ہے۔

بھری دُنیا میں اِک تو ہی نہیں تھا لیکن
بھری دُنیاؤں میں اِک تو ہی تھا ، چاہا تجھ کو

زندگی۔۔۔ ایک حقیقت جاوید
زندگی۔۔۔ اقتباس اے میرے دل

ہنگام بھولتا نہیں عرفانِ ذات کا
فیضان بے ثبات ہے اس بے ثبات کا

ترا تصوّر رنگین ہے شہر یارِ خیال
ترے خیال سے آباد ہے دیارِ خیال

ساٹھ اور ستر کی دہائی کے شعراء نے اُردو غزل میں نئے نئے تجربات کیے اضافتوں، تراکیب اور تکرارِ لفظی کے ساتھ ساتھ جوڑے دار الفاظ کی صورت میں لفظوں کے مرکبات کا استعمال بھی اس دور میں خاصہ مقبول رجحان رہا۔ مراتب اختر کی غزل میں بھی جوڑے دار الفاظ کا استعمال

موجود ہے کہیں یہ الفاظ مصرعہ اولیٰ کے شروع میں آتے ہیں تو کہیں مصرعہ اولیٰ کے آخر میں۔ کہیں مصرعہ ثانی کے شروع میں نظر آتے ہیں تو کہیں مصرعہ ثانی کے آخر میں موجود ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بات میں تسلسل رکھنے، اظہار میں شدت اور بیان میں زور پیدا کرنے کے لیے بھی جوڑے دار الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

مہک مہک وہ حقیقت وہ برگ برگ بدن
وہ سامنے بھی تھا ، غائب بھی تھا عجیب لگا

شاہین اُداس اُداس ہوائیں بجھی بجھی
رختِ سفر لٹا کے ستمبر سفر میں ہے

بجھی بجھی ہوئی آنکھیں ، شکن شکن چہرے
جب آفتاب کی لو بجھ رہی تھی ، گھر آئے

میں مسلسل تھا مکمل تھا مگر
ریزہ ریزہ زندگی کرتا رہا

ساٹھ اور ستر کی دہائی کے اُردو شعراء نے ایک نئے ڈِکشن کو متعارف کروایا اور غزل میں دوسری زبانوں کے لاتعداد الفاظ اس طرح فنکارانہ انداز سے استعمال کیے کہ ان کا استعمال گراں نہیں گزرتا بلکہ غزل کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ مراتب اختر نے بھی ایسے گھلے ملے الفاظ استعمال کیے جن سے ان کی شاعری میں انفرادیت پیدا ہوگئی۔ اُردو غزل کے اس کھیت میں مراتب اختر نے انگریزی ہندی اور دوسری زبانوں کی پیوندکاری اس انداز سے کی کہ یہی کھیت نئے انداز سے رنگ بکھیرتا سامنے آیا۔ مراتب اختر کے کلام میں سے اس کے چند نمونے یوں ہیں:

کب تم وفا کا ایک وچن بھی نبھا سکے
میں نے اِک ایک شرط تمہاری قبول کی

ریڈیو آب آن ہے ، آواز ہے
دوستو پھر جنگ کا آغاز ہے
دوستی کی ابتدا سے آج تک
مجھ سے وہ ناراض ہے کیا کاز ہے؟

اِک میں اور اِک احساس میرا قہوہ کڑواہٹ آوازیں
اِک ریستوران کے گوشے میں اِک تنہا شام منائی ہے

تلوے چپک چکے ہیں زمین کی سلیٹ سے
سر میں ریسرچ ، گھوم رہا ہوں خلاؤں میں

اِک آدمی کے شور سے چھت ڈولنے لگی
اِس ایڈیٹ کو ہال سے باہر نکال دے

آدمی لائف کے میجر منظروں سے دُور ہے
خود میں گم ہے، بستیوں گلیوں گھروں سے دُور ہے

یہ میرے قصبے کی اِک چھوٹی سی ہوٹل ، موڑ پر
جو مری کے اُڑتے اُڑتے منظروں سے دُور ہے

بنتِ کشمیر کی روتی ہوئی آواز سنو!
اِک خبر بیچنے بازار میں ہاکر نکلے

سورج کی اِک کرن نے اسے اطلاع دی
لڑکی نے باتھ رُوم کا پردہ گرا دیا

میں فائلوں کے ایک پلندے میں بند تھا
دفتر کی اِک دراز کے اندر بکھر گیا

رنگوں کا انسانی شخصیت، نفسیات، جذبات، احساسات اور فطرت سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ کائنات میں رنگوں کی ترتیب و آمیزش کو خالقِ کائنات نے بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔ بیسویں صدی کے شعرا نے اپنی شاعری میں رنگوں کا استعمال بھی کثرت سے کیا ہے۔ کیونکہ تیز اور چمکدار رنگ جہاں بچوں کو متاثر کرتے ہیں وہاں بڑوں کے لیے بھی باعثِ کشش ہوتے ہیں۔ رنگوں کی پسند اور ناپسند کا انحصار ذاتی یا شخصی سطح کے ساتھ ساتھ قومی سطح پر ہوتا ہے۔ اہلِ یورپ نیلے، سرخ، نارنجی، سبز اور زرد رنگوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں جب کہ ایشیائی ممالک کے لوگ سرخ، سبز اور زرد رنگ کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ رنگوں سے نفسیاتی کیفیت کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شاعری میں رنگوں کے معانی تمدن اور رسم و رواج کے پس منظر میں پھیلتے بڑھتے نظر آتے ہیں۔ سبز رنگ روزمرہ زندگی میں جاذبِ نظر متوازن اور دِلکش نظر آتے ہیں اور شعراء نے عام طور پر سبز رنگ کو بہار کے موسم، اچھی اُمیدوں، خواہشوں کے جنگل اور خوشبو سے تعبیر کیا ہے اور بعض اوقات سبز رنگ اُداسی، مایوسی اور ملال کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

مراتب اختر کی شاعری میں رنگوں کی یہ دھنک واضح طور پر نظر آتی ہی جس میں تمام رنگ نمایاں ہیں:

کتنے سبز سنہرے موسم بیت گئے یہ کہتے ہوئے
سنگت توڑ کے جانے والو، تم جاؤ، ہم آتے ہیں

کہانی سبز رنگوں میں نہا کر پھیلتی جائے
تجھے میری نظر کی روشنی موسم نما سمجھے

نیلا یا آسمانی رنگ بڑا پُرسکون ہوتا ہے۔ یہ رنگ خوبصورتی کے ساتھ ساتھ دلی فرحت و اطمینان کا بھی تاثر پیدا کرتا ہے۔ مراتب اختر نے اس رنگ کو اپنی شاعری میں یوں استعمال کیا ہے۔

نیلی فضا میں رینگتا بادل میرے لیے
لے کر رو پہلی یادوں کے لمحات آ گیا

سرخ رنگ جہاں اپنے اندر یہ خوبی رکھتا ہے کہ اپنی کشش کے سبب دوسروں کو اپنی طرف جلد راغب کر لیتا ہے وہاں حقیقی رنگوں میں شمار ہونے والا یہ رنگ جدت اور جاذبیت کی بھی عمدہ مثال ہے۔ محبت کرنے والے اس رنگ سے عام لوگوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی متاثر ہوتے ہیں اور اسی لیے اس رنگ کو محبت کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔ مراتب اختر کے ہاں اس رنگ کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔

سورج کے سرخ ہونٹ سے جھڑتی تمازتیں
کچھ دن میں چوس لیں گی گلوں کی مٹھاس کو

عام طور پر زرد رنگ کو مایوسی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور اس رنگ کو پسند کرنے والے لوگ تخیلاتی ذہن کے حامل ہوتے ہیں اور ہر وقت تخلیقی سرگرمیوں میں ہی مصروف نظر آتے ہیں۔ شاعری میں زرد رنگ دُکھ، ہجر، خوف، اندیشے اور اُداسی کی عکاسی کرتا ہے اور زیادہ تر خزاں سے وابستہ ہے۔ مراتب اختر کی شاعری میں بھی یہ رنگ اُداسی کا تاثر بکھیرتا نظر آتا ہے۔

چہرے پہ زرد دھول ، نظر بولتی ہوئی
اِک قہقہہ بجھا ہوا جلتے چراغ کا

مراتب اختر کی غزلیات ان کے اظہارِ ذات کا وسیلہ نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنے تمام خیالات، احساسات اور مشاہدات اس قدر سچائی سے بیان کیے ہیں کہ قاری کو اپنی آنکھوں کے سامنے ایک رنگا رنگ کہکشاں نظر آتی ہے۔ مراتب اختر کے کلام میں کہیں تو حُسنِ کائنات نظر آتا ہے تو کہیں یہی حسن امیجری کا رُوپ دھار لیتا ہے اور کہیں اِشاروں اور علامتوں کی وجہ سے کائنات کے اسرار کو

عیاں کرتا ہے۔ مراتب اختر کے کلام سے واضح محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے مناظرِ فطرت کو بہت خوبصورت انداز میں اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ ان کی ایک غزل ملاحظہ ہو:

جنگل میں، قہقہوں کا سماں، پھول کھل گئے
پکنک منا رہے ہیں جواں ، پھول کھل گئے

چوبی ہری چھتوں پہ ہواؤں میں جھولتی
بیلوں پہ سرخ سرخ نشاں ، پھول کھل گئے

آنکھوں میں رتجگوں کا سمندر لیے ہوئے
ہوں رات کی سڑک پہ رواں ، پھول کھل گئے

پڑنے لگے ہیں دل پہ گئے موسموں کے عکس
ہونے لگا ہے مجھ کو گماں ، پھول کھل گئے

آؤ چلیں ، یہ شہر یہ آشوب چھوڑ کر
ان وادیوں کی سمت ، جہاں پھول کھل گئے

پیڑوں کے جھنڈ جیسے ، گھٹائیں ہری بھری
رستوں کے رنگ جیسے یہاں پھول کھل گئے

مراتب اختر ایک درویش صفت شاعر تھے اور اس زندگی کے فانی ہونے پر ان کا ایمان پختہ تھا جہاں انھوں نے زندگی کی بے ثباتی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا وہاں انھوں نے موت کی حقیقت سے بھی آنکھیں نہیں چرائیں بلکہ ان کے کلام کے مطالعہ سے متعدد مقامات پر یہ احساس ہوتا ہے کہ

انھیں اپنی جواں مرگی کا احساس تھا اور اگر ان کا یہ کلام ان کی وفات سے پہلے چھپ جاتا تو ان کی موت کی پیشین گوئی ثابت ہوتا۔

کون مجھے افلاک کے پار بلاتا ہے
دل اس بھرے جہان سے بھرتا جاتا ہے

رُوح نے مرگِ بدن کا منظر دیکھ لیا
دیکھیں آ کر کون اسے دفناتا ہے

زندہ رہنے کے جشن کرتا رہا
رات دن اِک آدمی مرتا رہا

مراتب اختر کی وفات ان کے گھر سے کئی میل دُور دریائے راوی کے کنارے موضع شہامند بلوچ میں ہوئی اور اس شعر میں انھوں نے اپنی اس موت کی پیشین گوئی پہلے کر دی تھی۔ یہ درست ہے کہ زندگی اور موت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے کرنا ہے اور موت کا ایک وقت مقرر کر دیا گیا ہے جس کا سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو پتا نہیں لیکن بعض اشارات اور واقعات سے وہ اپنے پیارے بندوں کو اس طرح آ گاہ فرماتا ہے کہ جس سے انھیں اپنی موت کے حوالے سے کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ مراتب اختر کا یہ شعر اس کا واضح ثبوت ہے۔

بھائی بہنوں سے دوستوں سے دُور
شام کے وقت مر رہا ہے کوئی

شاعر معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والے ہر تعمیری اور تخریبی عمل سے متاثر ہوتا ہے اور پھر اپنے تاثرات کو شاعری کے ذریعے بیان کرتا ہے اسی لیے ہر شاعر نے اپنے عہد کے معاشرتی مسائل کو اشعار میں پرویا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو لسانی قوت کے علاوہ ضمیر بھی عطا کیا ہے جو اس

کے اندرونی تاثرات کو بیان کرتا ہے۔ اچھائی پر سراہتا ہے تو غلطی پر ملامت کرتا ہے۔ ضمیر کی یہ بھی خاصیت ہے کہ حقائق کو جلد یا بدیر تسلیم کر لیتا ہے۔ مراتب اختر کے معاملات بھی کچھ اس طرح کے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ہر طرح کا ناتا توڑ کر ہمیشہ کے لیے نہ ملنے کا عہد کر کے زمانے کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے اپنے ضمیر کی آواز پر فیصلہ بدل لیتے ہیں اور انھیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ ان کا ترک تعلق کا فیصلہ غلط تھا اور پھر انھیں اپنے لگاؤ کی خاطر واپس پلٹنا پڑتا ہے۔ مراتب اختر اس حوالہ سے لکھتے ہیں:

پھر اسی شہر میں آیا ہوں جسے چھوڑا تھا
پھر اسی جسم کا سایہ ہوں جسے چھوڑا تھا
جسم کو ساتھ لیے پھر اسی ماحول کے ساتھ
رابطے جوڑنے آیا ہوں جسے چھوڑا تھا

بڑھتے ہوئے معاشرتی مسائل کے سبب ہر شخص فکرِ معاش میں مصروف ہے۔ نفسانفسی کے اس دور میں میل ملاقاتیں اور ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں شامل ہونا کم ہوتا جا رہا ہے۔ ہر شخص کولہو کے بیل کی مانند اپنے گرد و پیش سے بے خبر اپنے مسائل کو وسائل کے مطابق حل کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ کسی کو کسی سے ملنے کی ضرورت ہے نہ طلب۔ امیر اپنی امارت میں گم ہے تو غریب اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے شب و روز مصروف نظر آتا ہے اور جب حالات ایسے ہوں تو رابطہ کیسے قائم کیا جا سکتا ہے۔ مراتب اختر اس حوالہ سے لکھتے ہیں:

ہم نے اے مصروف مسائل کی دُنیا
اپنے اپنے حال میں رہنا جان لیا

وقت کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدریں زوال پذیر ہو رہی ہیں۔ لالچ، خودغرضی اور مفاد پرستی جیسی سماجی برائیاں عام ہوتی جا رہی ہیں۔ ہوا کا رُخ دیکھ کر راہیں متعین کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ نظریات اور اصول پسندی پر قائم رہنے والوں کا فقدان ہے اور وفا شعاری کی جنس ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ یہ خودغرض، مطلب پرست اور عیار لوگ مہر و مروّت سے عاری ہیں اور

اپنی پرزور دلیلوں اور مصنوعی وفاؤں پر یقین دلاتے ہوئے ساتھ نبھانے کا وعدہ تو کرتے ہیں مگر جونہی کسی دوسری طرف سے ذرہ بھر بھی فائدہ نظر آتا ہے تو اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔ چڑھتے سورج کے پجاری ان لوگوں کے رویوں سے مراتب اختر جیسا شخص بھی متاثر ہوتا ہے اس کا بھی وفاؤں سے یقین اُٹھ جاتا ہے اور وہ ایسے حالات میں اپنی دلی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

مجھ کو بڑا وثوق تھا جن کی وفاؤں پر
وہ لوگ بھی بدل گئے حالات کی طرح

ہمارے معاشرے میں حقیقت پسندی سے دُوری اختیار کی جاتی ہے اور فروعی مسائل کو زیادہ اُچھالا جاتا ہے۔ تعمیری کی بجائے تخریبی کاموں پر زیادہ لگن اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ آبادی میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا جا رہا ہے پیار، خلوص اور محبت کی جنس نایاب ہوتی جا رہی ہے اور یہ سب کچھ ہمارا اپنا پیدا کردہ ہے۔ اگر ہم آج بھی حق کا ساتھ دیں تعلیمات اسلام پر عمل کریں اور انسانیت سے محبت پر عمل پیرا ہو جائیں تو حالات یکسر مختلف ہو سکتے ہیں مگر ہم جس رستے پر چل نکلے ہیں اور جن مسائل میں اُلجھے ہوئے ہیں وہاں تنہائی کا احساس ہونا نئی بات نہیں۔

مراتب اختر اس حوالے سے کہتے ہیں:

حق چھوڑ کر فروع میں اُلجھا ہوا ہوں میں
سچ ہے کہ اپنے آپ سے بچھڑا ہوا ہوں میں
چاروں طرف محیط ہجومِ مغائرت
یکبارگی جہاں میں تنہا ہوا ہوں میں

اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے ہر وقت اس کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔ اس کی ذات سے محبت کرتے ہیں اور اس کے ہر حکم پر سر جھکاتے ہیں اور یہی ایمانِ کامل بھی ہے اور عشقِ حقیقی بھی مگر جہاں عشق ہوتا ہے وہاں پر معشوق اور عاشق کے درمیان شکوے شکایت بھی ہوتے رہتے ہیں اور شاعر تو اکثر خدا سے شکوہ کرتے رہتے ہیں۔ مراتب اختر کی شادی کے کچھ عرصہ بعد ان کے ہاں ایک بیٹے کی ولادت

ہوئی جو چند دنوں کے بعد خالقِ حقیقی سے جا مِلا۔ ہمارے معاشرے میں بیٹے کو وراثت کا اَمین اور نسل و نسب کو جاری رکھنے کا سبب تصوّر کیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اولادِ نرینہ ہی والدین کے لیے شجر سایہ دار ثابت ہوتی ہے۔ مراتب اختر نے اس حوالے سے یوں کہا ہے:

اِک سایہ دار، پیڑ کو جڑ سے اُکھاڑ کے
کیا مِل گیا تجھے میری دُنیا اُجاڑ کے

اللہ تعالیٰ نے نبیٔ اکرم ﷺ کے ذریعے ایک ایسا دین نازل فرمایا جس میں ہر طبقے کے حقوق وفرائض اور ذمہ داریوں کے حوالہ سے واضح طور پر درج ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی، اساتذہ، رشتہ داروں، پڑوسیوں، یتیموں، بیواؤں، حتیٰ کہ ہر طبقہ کے بارے میں واضح ہدایت اور راہنمائی موجود ہے مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں رائج مغربی جمہوریت کے سبب ان اصولوں اور حقوق وفرائض سے دُوری اختیار کر لی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاقی اقدار ختم ہوتی جا رہی ہیں اور کسی کو اپنا جائز حق لینا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ طاقت ور کمزور کو، سرمایہ دار مزدور کو اور جاگیردار مزارع کو اس کا حق دینے کے لیے تیار نہیں۔ اس صورتِ حال کو مراتب اختر نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کا برملا اظہار بھی کیا۔ ان کا یہ شعر اس کیفیت کا عکاس ہے۔

پامال ہوئی سلسلۂ حق کی صدارت
دُشمن کا ہر اندازِ ریا عہد نما ہے

ایک ہی ماں کے پیٹ سے جنم لینے والے بھائیوں کے درمیان اختلافات کوئی نئی بات نہیں یہ سلسلہ تو ازل سے چلا آ رہا ہے اور دُنیا کا پہلا قتل بھی اک بھائی کے ہاتھوں دوسرے بھائی کا قتل تھا اور قرآن پاک میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپ سے جو سلوک کیا وہ قصہ بھی درج ہے۔ بھائی جہاں بھائیوں کی طاقت اور بازو ہوتے ہیں وہاں بعض اوقات ایک دُشمن کا رُوپ بھی دھار لیتے ہی۔ برادرانِ یوسف کے بعد بھی بھائی سے بھائیوں کی سفاکی کے واقعات ہمارے اردگرد میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مراتب اختر کے ساتھ بھی بھائیوں نے کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ باپ

کی وفات کے بعد تقسیم وراثت کے حوالے سے مراتب اختر کے ساتھ جو زیادتی ہوئی اس کا ذِکر انھوں نے یوں کیا ہے:

ان بھائیوں کی عمر خدایا دراز کر
دیتے ہیں میرا حق مجھے خیرات کی طرح

—

یہ گھر کے راز ہیں کہوں کیسے زبان سے
کیا دُکھ ملے ہیں مجھ کو مرے بھائی جان سے

ہر محبِّ وطن کی طرح مراتب اختر کے دل میں مُلک اور ملت سے محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جب پاکستانی مجاہدوں نے ہمت، دلیری اور جواں مردی کی بے مثال داستان رقم کرتے ہوئے دُشمنوں کو دندان شکن شکست دی تو مراتب اختر کے اندر کا جذبہ یوں قلم کی نوک پر آ گیا۔

ایک مایوسی جو تھی جزو مقدر جیت لی
تو نے اے میرے وطن یہ جنگ یکسر جیت لی

اسی جنگ کے دوران جب محبِّ وطن لوگ اپنی فوج کی پشت پر کھڑے تھے تو وہاں بعض مُلک دُشمن عناصر اپنی منفی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ وطن جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اس کے مکین اسلام کے اصولوں سے دُوری اختیار کرتے ہوئے اپنے ہی بھائیوں کا خون چوسنے میں مصروف تھے۔ مراتب اختر جیسا حساس شخص بھلا اس ظلم وستم اور غیر قانونی وغیر اخلاقی رویے کے خلاف کب تک خاموشی اختیار کر سکتا تھا۔ ان حالات میں انھوں نے جو کچھ محسوس کیا، ان کے دل پر جو بیتی وہ اس بات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اے زمیں کا خون پیتے باسیو
یہ بھی جینے کا کوئی انداز ہے

مراتب اختر کو اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ ہم آپس کے لڑائی جھگڑوں میں پھنس کر کمزور ہو گئے ہیں اور دُشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اتحاد سب سے ضروری ہے اور اگر ہم نے اتحاد کر لیا تو پھر مسلمانوں کے سامنے ڈٹ کر لڑنے کی ہمت کسی میں نہیں۔ انھوں نے جہاں دُشمن پر گہری نگاہ رکھنے کا مشورہ دیا ہے وہاں یہ بھی کہا ہے کہ آپس کے لڑائی جھگڑے بھلا کر دُشمن پر ایسا کاری وار کرو کہ وہ آئندہ ارضِ پاک کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی بھی جرأت نہ کر سکے۔ مراتب اختر ایک وطن پرست شاعر تھے اور ہمیشہ ارضِ پاک کی خوشحالی اور سلامتی کے متمنی رہے ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

اے وطن کی خاک! دائم خوش رہیں باسی تیرے
اے سمندر یہ تیرے لعل و گہر ہنستے رہیں

ایک کامل مسلمان کی طرح مراتب اختر کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے وہ دُعائیں سننے والا ہے۔ دُعائیں قبول کرنے والا ہے اور انسان کو ہر مشکل میں اس کے سامنے جھولی پھیلانی چاہیے، ان کا یہ شعر اس بات کا آئینہ دار ہے۔

ہم اس سے مانگتے ہیں جو ہم سے ہے ماورا
سارا نظام دہر ، دُعا سے الگ نہیں

جہاں مراتب اختر اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ دُعاؤں کے اثر سے تقدیر بدل جاتی ہے وہاں وہ کہتے ہیں کہ جب تک دُعا مانگتے وقت دِل میں درد نہ ہو اور جذبے بھی سچے نہ ہوں تو دُعا قبول نہیں ہوتی۔ یعنی دُعا کی قبولیت کے لیے خلوص، لگن، تڑپ اور اُمنگ کا ہونا ضروری ہے وہ بے یقین لوگوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ صف بہ صف جھکی ہوئی کمریں، دراز ہاتھ
یہ بے یقیں دل جو مگن ہیں دُعاؤں میں

مراتب اختر دُعا کو جہاں مسائل کے حل کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں

وہاں وہ اسے اللہ اور بندے کے درمیان رابطے کا ایک ذریعہ بھی قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

یہیں بیٹھے ہوئے لوٹ آتا ہوں اس سے مِل کر
رابطہ بن کے میرے لب پہ دُعا آتی ہے

مراتب اختر انسان کو خلیفۂ خداوندی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اپنی محنت، کوشش اور جدوجہد سے انسان بڑی سے بڑی مشکل پر قابو پا سکتا ہے اور اپنی ہمت کے بل بوتے پر اپنے راستے میں حائل تمام رکاوٹیں دُور اور تمام اندھیرے ختم کر سکتا ہے۔ وہ انسان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اُٹھے اور ہمت سے اپنے مسائل پر قابو پانے کا حل تلاش کر کے اس پر عمل پیرا ہو:

نسلوں کو جن کے سامنے کوئی اُفق نہیں
اس دُھند سے نکال نئی راہ پہ ڈال دے
انسان اے زمین کی خلافت کے پاسبان
اُٹھ اور مہک مہیب اندھیرے اُجال دے

اس حقیقت سے کوئی بھی انکاری نہیں کہ نہ تو کمان سے نکلا تیر واپس آ سکتا ہے اور نہ ہی گزرا وقت۔ مراتب اختر بھی اس بات پر یقین رکھتے تھے۔ وہ اس جذبے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

سدا گزرتا رہا ہے، گزر رہا ہے یہ وقت
کبھی یہ لوٹ کے آیا نہیں نہ آئے گا

مراتب اختر کی غزلوں میں جہاں تصوّف دیہی زندگی، عصری مسائل اور فکری و جذباتی کشمکش کو موضوع بنایا گیا ہے وہاں فنی لحاظ سے لفظیات، تشبیہات و استعارات، تمثال نگاری، علامتوں اور انگریزی الفاظ کا بہترین نمونہ ان کے کلام میں موجود ہے۔ بلاشبہ وہ ساٹھ اور ستر کی دہائی کے ان شعراء میں سے ہیں جنھوں نے اُردو غزل کو ایک نیا رنگ بخشا۔

حوالہ جات

۱۔ عون الحسن غازی، نقدِ مراتب، افتخار جالب، شیخوشریف: ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۴ء، ص ۶۰۔۶۱

۲۔ عون الحسن غازی، نقدِ مراتب، وحید اطہر، ص ۱۲۲

باب ششم

مراتب اختر کی نظم گوئی

مراتب اختر کی نظم گوئی

جدید اُردو نظم کا وہ پودا جسے آزاد اور حالی نے لگایا تھا اور اس کی آبیاری میں اکبرالہ آبادی، اسماعیل میرٹھی اور علامہ اقبال جیسے شعرا کا ہاتھ ہے تو اسے پروان چڑھانے میں میراجی اور ن۔م۔راشد نے بھی اپنا حصہ ڈالا اور اس کی تراش خراش کر کے اس کو ایک مضبوط تناور درخت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے شعرا نے آزاد نظم کو اپنے اظہار کا سب سے اہم اور مقبول ذریعہ تصوّر کیا اور جان بوجھ کر پابند نظمیں لکھنے سے گریز کیا۔ ان شعرا کی کوشش سے پہلی بار اُردو شاعری میں وسیع پیمانے پر آزاد نظم لکھی گئی۔ اس دور کے اکثر شعرا نے تو صرف نظم کے میدان میں طبع آزمائی کی مگر کچھ ایسے تھے جنھوں نے غزل اور نظم دونوں میدانوں میں اپنے فن کے جوہر دکھائے۔

مراتب اختر کا شمار بھی ایسے شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نظم پر بھی طبع آزمائی کی اور اپنے اسلوب، فن اور فکر کی وجہ سے ہم عصر شعرا میں اہم مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مراتب اختر کی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف نقاد ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

> یہ آزاد نظمیں ہیں لیکن سطروں کی تقسیم پر مہارت ہر نظم میں موجود ہے۔ فنی عبور سے قطع نظر ان نظموں میں مراتب اختر کی شخصیت، ان کے خیالات اور محسوسات کی تصویریں ہر جگہ موجود ہیں۔ نظموں سے دوستوں کی محفلوں میں شاعر کی تنہائی، انسان کے مقابل کائنات کی وسعت، زماں کے بہتے ہوئے دھارے میں انسان کی بے بسی، دُنیا کے ریلے، ہجوم، ٹریفک، ہوٹلوں میں گفتگو کے سلسلے، روشنیاں اور ان میں تنہا انسان جنھیں جلد ہی ماضی کا حصہ بن کر لامحدود میں جذب ہو جانا ہے۔ یہ احساس کہ ہم جانے

والے ہیں حسین منظروں، حسین موسموں اور حسین لوگوں کے جلو میں بھی خوشی، تسکین اور اطمینان مہیا نہیں ہونے دیتا، انسانی رُوح کی بے چینی، کرب، فضا پذیری، سب کچھ ایک بے کار ڈرامہ، لایعنیت اور بے معنویت کا گہرا احساس ان نظموں کی سطر سطر سے آشکار ہے۔ (۱)

مراتب اختر نے نظموں میں نئے نئے تجربات کیے کیونکہ ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو غوث عبدالقادر جیلانی کی اولاد ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں تصوّف کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے اور کئی نظموں کے عنوان قرآن پاک کی سورتوں کے نام پر رکھے گئے ہیں ''گزرا بن برسے بادل'' کا آغاز ''وما ادراک'' سے ہوا ہے، جس کا نمونہ ملاحظہ ہو:

اے حادث وقدیم
میں مختصر ہوں وقت کی رفتار تیز ہے
میں بے خبر ہوں مجھ کو خبر دے، نئے علوم
ہر وقت جن کے کھوج میں خود سے ہوں بے خبر
جن کی طلب میں چہرے بھی رُوح کی طرح مسخ
ان سے زمین پہ رینگتی دقّت بھی سہل ہے
ان سے خلا میں اُڑتے عناصر بھی زیر ہیں
پھر بھی یہ چند کھوکھلے لفظوں کا ڈھیر ہیں''

مراتب اختر نے اپنی نظموں میں قرآنِ کریم کی سورتوں کو شعری پیرائے میں بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے جس کی ایک مثال ان کی نظم ''التکاثر'' ہے جس میں مال و دولت میں زیادتی کی حرص اور آخرت سے غفلت کے مفہوم کو پیش کیا ہے۔

التکاثر

غافل لوگو!
مٹی منہ کھولے تیار سدا!

معلوم تمہیں ہو جائے گا،
(وہ دن ہے بہت نزدیک) ادھورے دولت کے دیوانو!
کھل جائے گا سب معلوم تمہیں ہو جائے گا!
اس افسانے کا انت
جو کچھ تم جانو اس کو پہچانو
دیوانو! اس کو پہچانو
جب آگ جلے گی تب اس کو پہچانو گے
دیوانے لوگو!
کب اس کو پہچانو گے؟!
اس افسانے کا انت تمہیں معلوم ہے
----------اور معلوم نہیں

یہ حقیقت ہے کہ شاعری ایک فن ہے اور اپنے مافی الضمیر کو شعری صورت میں بیان کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں اور پھر قرآنِ کریم کی مبارک آیات کا ترجمہ شعری صورت میں بہت مشکل کام ہے، مگر مراتب اختر نے اس کام کو انتہائی احسن طریقے سے سرانجام دیا ہے۔ سورت ''القارعہ'' کا ترجمہ اس کی بہترین مثال ہے۔

القارعہ

کھڑکھڑانے والی
ہاں اِک کھڑکھڑانے والی
کیا معلوم تم کو کھڑکھڑانے والی ساعت آئے گی
اور پھر بکھر جاؤ گے تم سب (معتبر ہواب) پتنگوں کی طرح
یہ سلسلے اُونچے پہاڑوں کے اُڑیں گے روئی کے گالوں کی صورت

دن بہت بھاری ہوا
بدشکل چہرے آگ کا ایندھن بنیں گے
دن بہت بھاری ہوا
(سب لوگ اک جیسے نہیں ہوتے)
جو چہرے روشنی ہوں گے چمکتی گھاس پر
دائم مہکتی گھاس پر
چھاؤں تلے
ان بے خزاں اشجار کی چھاؤں تلے
نہروں کنارے
جاوِداں میٹھی، رواں نہروں کنارے
سوئیں گے
آزار سے محفوظ ہوں گے
آئے گی۔۔۔انصاف کی زندہ علامت آئے گی
وہ کھڑکھرانے والی ساعت آئے گی

مراتب اختر کی نظموں کے حوالے سے معروف نقاد ڈاکٹر تبسم کاشمیری اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وما ادرک" سے شروع ہونے والی مراتب اختر کی یہ نظمیں "بے خبری سے خبر" تک کے سفر کی داستان ہیں۔ زمین پر زندگی گزارتے ہوئے تھک ہار جانے والا شاعر بالآخر اپنے گناہوں کا حساب چاہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ باریابی کا طالب ہوتا ہے اور یوں اس زمینی سفر کی داستان پوری ہو جاتی ہے جہاں قطرہ عشرتِ وصل سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ ان نظموں کے "الانشراح" میں اس کی باطنی روایت کا شعور موجود ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ باطن کے تجربوں کی نسبت مراتب کے اس مجموعے میں غالب دکھائی دیتی ہے، جہاں وہ ذاتِ حقیقی کے مشاہدے میں گم ملتا ہے۔ ان نظموں کا

شاعر صرف بصیرت کا شاعر نہیں ہے۔اس کی بصارت کی آنکھ بھی وا ہے۔وہ زمین پر ہونے والی انسانی واردات اور اس کے آشاب کے شدید کرب میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

قرآنِ مجید کا ترجمہ،تفسیر اور تشریح عام آدمی کے بس کی بات نہیں اس کے لیے وسیع مطالعہ اور عربی زبان پر دسترس ضروری ہے اور پھر اشعار کی صورت میں ترجمہ کرنا ہو تو اور بھی مشکل ہو جاتا ہے،مگر مراتب اختر نے یہ کام بہت ذمہ داری سے کیا ہے۔سورۃ الانشراح کا ترجمہ اس کی ایک اور عمدہ مثال ہے۔(۲)

الانشراح

تمہارے سر سے بوجھ اُتارا
کیا تھا جس نے تجھے نڈھال
تمہارا سینہ کھول دیا۔۔۔(آئینہ صاف کیا)
اور ذِکر تمہارا کیا بلند(زمینوں اور زمانوں میں)
ہے سختی میں آرام
سنو! ہے سختی میں آرام!
کرو تم اپنے گھر کے کام
مگر جب فارغ ہو جاؤ تو یاد کرو مجھ کو
دل میں آباد کرو مجھ کو
تم ڈھونڈو مجھ کو راتوں اور دنوں میں مجھ کو پاؤ گے
پل پل ہوں تمہارے ساتھ مجھے تم ڈھونڈو مجھ کو پاؤ گے

شاعر معاشرے کی آنکھ ہوتا ہے اور اپنے گرد و نواح کے واقعات کو محسوس کرتا ہے اور پھر بغور مشاہدہ کرنے کے بعد جو تبدیلی محسوس کرتا ہے اس کو اشعار کا رنگ دیتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت

ہے کہ شاعر کے محسوس کرنے کا انداز عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے اور اِسے ہی شعری تجربہ کہتے ہیں۔ آزاد نظم کے شعراء نے اپنی نظموں میں احساساتی آہنگ سے بھی کام لیا ہے۔اس لیے نئی نظم کے قاری کو شعر میں موجود خیال اور جذبے کو سمجھنے سے زیادہ محسوس کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔مراتب اختر کی نظموں میں یہ احساس جگہ جگہ اُجاگر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

ورق ورق
ایک نام بدنام ہو رہا ہے
ورق ورق
میرے خواب، خوابوں کے سلسلے
مرے سامنے تم نہ کوئی تم سا
تمام گزرے ہوئے بدن، پھول، گفتگو، دن، لباس
اپنی حماقتوں کے سمے، جو واپس نہ آئیں گے، یاد آ رہے ہیں

شاعری میں دیگر لوازمات کے ساتھ ساتھ آہنگ کو بھی بنیادی حیثیت حاصل ہے اور آہنگ پیدا کرنے میں بحر سے زیادہ شاعر کی طبع اور مزاج کا عمل دخل ہوتا ہے۔آہنگ میں شخصیت، احساس، خیال، اصوات، تکرارِ الفاظ اور مفہوم کا کردار اہم ہے ان کے امتزاج سے ہی آہنگ پیدا ہوتا ہے۔مراتب اختر کی نظموں میں یہ آہنگ نمایاں نظر آتا ہے۔اس آہنگ کی ایک بہترین مثال ان کی نظم ''سنجوگ'' ہے۔

''سنجوگ''

تو شبنم میں سورج
پھر بھی ہم دونوں
اِک راہ پہ چلنے والے ہیں
ایسا ہی اظہار ان کی نظم ''اجنبی'' میں ہوا ہے

''اجنبی''

میں کہ اِک گزرا ہوا دن
پھر بھی تیرے سامنے
میں کہ آنے والے موسم کی جھلک
میں پھر بھی تیرے سامنے
میں کہ جیسا بھی ہوں (میں کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں)
میں پھر بھی تیرے سامنے
سامنے ہوں اور تم نے آج تک دیکھا نہیں

مراتب اختر علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری سے بہت متاثر تھے۔ وہ بھی اپنی قوم کو ترقی کی معراج تک پہنچتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے اور انھوں نے اپنی شاعری کو بھی اسی ڈگر پر چلانے کی کوشش کی۔ انھوں نے جو کچھ محسوس کیا اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اپنی عمدہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنی شاعری کے ذریعے تہذیب کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔ مراتب اختر وہی جوش وجذبہ جو اِن کے دِل میں تھا وہی قوم کے سپاہیوں کے دل میں بھی جگانا چاہتے تھے اور وہ احساس جو انھیں تھا وہ چاہتے تھے کہ دوسرے بھی اس کو محسوس کریں ان کی نظم ''اُٹھو سپاہی'' اس کی عمدہ مثال ہے۔

''اُٹھو سپاہی''

اُٹھو سپاہی!
زمین کی تہ سے ایک آواز اُبھر رہی ہے
گھٹاؤں کی طرح، جاگتے شہر کے مکانوں،
جری جوانو پہ چھا رہی ہے
تمہیں بھرے شہر کی اِک اِک زندگی مسلسل بلا رہی ہے
یہ ننھے منے دلیر بچے

جواں جو اپنے وطن پہ مٹنے کے منتظر ہیں
ضعیف بوڑھے محاذ سے آنے والی خبروں کو سن رہے ہیں
لبوں سے حقے کی نے ہٹا کر
کہیں خیالوں میں دُور جا کر تمہیں مسلسل بلا رہے ہیں
اُٹھو سپاہی
یہ نو نومبر کی رات کتنی ڈراؤنی ہے
خموش گلیوں میں صرف کچھ نوجوان قدموں کی سرسراہٹ
یہ دھیمے دھیمے سے قہقہے۔۔۔ان کے قہقہے، پہرہ دار جیسے
یہ چھوٹی چھوٹی سی ٹولیوں میں بٹے ہوئے پہرہ دار۔۔۔
طاقت میں مجمع صد ہزار جیسے
لڑائی کو تین دن ہوئے سترہ سال بیتے
جو تم نے دیکھے جو تم پہ گزرے
صدا سنو! سال ایک اِک کر کے سامنے سے گزر رہے ہیں
زمیں کی تہ سے ایک آواز بن کی جیسے اُبھر رہے ہیں
تمہیں یہ سب یک زبان ہو کر بلا رہے ہیں،
اُٹھو سپاہی!
اُٹھو سپاہی! قلم سنبھالو!

اس معاشرے میں جہاں ہر شخص اپنے آپ کو اعلیٰ اور برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے عیب چھپانے کے لیے کوشاں رہتا ہے وہاں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو دوسروں کے لگائے گئے الزامات کو بھی قبول کرتے ہیں اور اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ غلطی،

گناہ اور جرم اس کے خمیر میں شامل ہے۔ مراتب اختر بھی ان چند لوگوں میں ہیں وہ اپنی نظم ''ناکارہ'' میں لکھتے ہیں:

ناکارہ

مجھے سب کہتے ہیں ناکارہ
اس بستی کے سب لوگ ہیں مجھ سے اچھے
دن بھر کاموں میں مصروف
یہ شب بھر نیندوں میں مصروف
جوان سے بُرا کرے، یہ بُرا کریں گے اس سے
جوان سے بھلا کرے، یہ بُرا کریں گے اُس سے
یہ مجھ سے اچھے، میں ناکارہ
شب بھر جاگتا ہوں
بستی کی گلی گلی، اندھیرے، چھانتا ہوں
جب دن چڑھتا ہے
سو جاتا ہوں
سورج سر پر آتا ہے۔۔۔ڈھل جاتا ہے
چہرے پہ ندامت لیے ہوئے
پھر اپنے اس معمول کے پیچھے بھاگتا ہوں
جب جاگتا ہوں
لو شام ہوئی
بستر سے جدا ہونے کی ساعت آئی۔۔۔آغاز کروں!
سب کہتے ہیں۔۔۔ناکارہ ہوں۔ میں مانتا ہوں''

مراتب علی اختر نے اپنی نظموں میں جہاں معاشرتی مسائل کا ذِکر کیا ہے وہاں رُومانی فضا بھی پیدا کی ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل کے ساتھ گرتی ہوئی اخلاقی قدروں کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی رومان پرور تاثر کی حامِل یہ نظم اس کی ایک مثال ہے۔

''بارش ختم ہوئی پھر پڑھ لیں گے
آؤ سیر کریں
گھاس کے بیچوں بیچ گزرتی اس پتھریلی، بھیگی بھیگی ٹیرس پر
دور دور تک گھومیں
آؤ سیر کریں
بند دریچوں سے باہر، ان نرم ملائم پردوں سے
چھنتی رات، اکیلی رات، اندھیری رات پکارتی ہے
اُڑتے پل پل، مڑتے ورق ورق، بادل ویران سڑک
تیز ہوا، پتھروں کی صدا اور گلیوں کی خاموشی ہمیں پکارتی ہے''

مراتب اختر کے دور میں ہی لسانی تشکیلات کی تحریک کا آغاز ہوا۔ لسانی تشکیلات الفاظ کو اشیاء کی نمائندگی کی بجائے بطور اشیاء مرکب ترکیبی میں شامل کرتی ہیں۔ الفاظ بطور اشیاء شعر و ادب سے باہر کوئی وجود نہیں رکھتے۔ الفاظ کو تخلیق کار اشیاء کا وجود دیتا ہے اور الفاظ بطور اشیاء جلوہ گر ہوتے ہیں۔ مراتب اختر کے ہاں بھی لسانی تشکیلات موجود ہیں۔ ان میں فکر کا عنصر غالب ہے۔ ان کی نظم میں ''ریزہ ریزہ'' کا لفظ جس طور شئیت حاصل کرتا ہے، دیدنی ہے۔

''یہ ریزہ ریزہ
اسی دھانے کی سمت، واپس
جہاں سے آغاز کا بہاؤ

زمین کو چاٹتی لکیروں میں بٹ گیا تھا
زمیں کو سونگھتے
بسیروں کی چاپ بن کر مسافتوں میں
رکاوٹوں کو لتاڑتا
آس پاس میں پھیلتا گیا
جنگلوں سے
ہری کھیتیوں سے کچے اناج کی بو اُمڈ رہی ہے
زبان کو ذائقے، شکم کو غذا کی حاجت، بدن پہ
پتوں کے بعد، طلوعِ اطراف پہ مسلط، قدم
قدم ہر قدم نئی سمت بڑھ رہا ہے۔ یہ ریزہ
ریزہ بہاؤ ____
گزر رہی ہیں یہ تیز رفتار کالی گھڑیاں ____ اذان ____ بچے
سکول کی سمت بڑھ رہے ہیں، یہ ریڈیو ہو گیا پرانا، یہ میز ٹی۔ وی
کی منتظر ہے ____ زمیں کشش کھو چکی ہے ____ سرعت دنوں
کی صورت کیلنڈروں کو بدل رہی ہے۔ گھڑی کے ڈائل میں
موسموں کا عذاب مٹی؛ جواں ہوئے، دفتروں، دوکانوں
میں منتشر ہیں۔ ٹرین کی بھاگتی صدا دُور ہو رہی ہے بہاؤ؛
یہ ریزہ ریزہ دریا چڑھا ہوا ہے
چلو یہ دریا عبور کر لیں
کہیں یہ دریا اُتر نہ جائے
چلو انہیں بہتے ہوئے پانیوں کا لباس پہنیں'' (ص:۱۴۱،۱۴۲)

نظم کا آغاز ''ریزہ ریزہ'' سے ہوا ہے اور مراتب اختر نے اس ریزہ ریزہ کو بنیاد بنا کر مختلف عناصر کو تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس نظم میں لہجہ دھیما اور لسانی تشکیلات کی فراوانی ہے۔ الفاظ بطور اشیاء کے سلسلے میں سماعت و بصارت ہی سے کام لیا جاتا ہے اور وہ الفاظ جو سماعت و بصارت کی بجائے دیگر حواس سے متعلق ہیں وہ شئیت کا درجہ اختیار کرتے ہوئے سماعت و بصارت کی زد میں آ جاتے ہیں۔ مراتب اختر کی شاعری کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے ہم عصر شعرا کا اثر لیا اور اپنی شاعری کو جدید رنگ میں ڈھالا۔

لسانی تشکیلات کی تحریروں سے وابستہ شعرا نے لفظوں کی اصوات سے بھی کام لیا ہے۔ کبھی وہ ''ہم صوت'' لفظ استعمال کرتے ہیں اور کبھی وہ مخصوص صوت کے حامل لفظ لاتے ہیں بعض اوقات ان دونوں صورتوں کو اکٹھا بھی کام میں لایا جاتا ہے۔ لفظوں کی اصوات نظم میں قوسِ قزح کے رنگ بکھیرتی ہیں۔ مراتب اختر کی نظموں میں لفظوں کی یہ اصوات پائی جاتی ہیں، جیسے:

''یہ گاؤں
دُور یہاں سے وہ پیڑوں کی چھاؤں
یہ اُجڑا ہوا کنواں
یہ سائیں سائیں کرتے منظر
سرسر کرتے سبز گھنے سرکنڈے
جو میرے بھیدوں سے آگاہ
میں ان کے بھیدوں سے آگاہ
مجھے سب کہتے ہیں گمراہ''

رِم جھم پڑتی پھوار پیار کرنے والوں کے تن من کو بہت متاثر کرتی ہے۔ ساون کے برستی بارش میں ہجر کی صورت میں آنکھیں بھی برستی ہے اور وصال میسر ہو جائے تو موسم کا مزہ دوبالا ہو

جاتا ہے کیونکہ اصل موسم تو اندر کا موسم ہوتا ہے۔ دِل مطمئن ہو تو صحرا کے سناٹے بھی گیت معلوم ہوتے ہیں اور پریشانی کے لمحات میں شہر بھی اُجاڑ نظر آتے ہیں۔ برسات کے موسم کی سرمستیاں شاعر کی رگ رگ میں اُترتی محسوس ہوتی ہیں اس کا دل چاہتا ہے کہ بادل کھل کر برسے مگر بادل کب کسی کی مانتے ہیں وہ تو قدرت کے اشارے کے محتاج ہیں اور اگر اِشارہ نہ ہو تو بن برسے گزر جاتے ہیں۔ مراتب اختر نے نظم ''گزرا بن برسے بادل'' میں اس کیفیت کا اظہار بہت خوبصورت پیرائے میں کیا ہے۔

''دن میں ڈولتے تھے زمزمے سے
رات کے وہ خاص لمحے آرہے تھے، جو اکیلے میں گزرتے ہی نہیں
اپنے بدن کی گھاٹیوں اور چوٹیوں کو
جن پہ بادل آج بھی برسا نہ تھا، تکتی رہی
جغرافیہ پڑھتی رہی
ان موسموں ان ساعتوں سے جانے کتنی بار ٹکرائی
اُمڈ آتے ہیں بادل
اور بن برسے گزر جاتے ہیں بن بادل''

مراتب اختر ایک حساس طبیعت کے مالک تھے انھوں نے اپنے اردگرد ہونے والے ظلم وستم اور معاشرتی ناہمواریوں کو نہ صرف محسوس کیا، بلکہ انھیں اپنی شاعری کا موضوع بھی بنایا۔ ان کی نظم ''جاگتے خواب کے دوران'' ایک معاشرتی اصلاحی نظم ہے جس میں ان تمام عوامل کا ذِکر کیا گیا ہے جو معاشرے کی تباہی کا سبب بنتے ہیں۔ اس نظم میں ایسا تاثر اُبھرتا ہے کہ بدصورت افراد بدی کے فرشتے ہیں اور معاشرے میں جگہ جگہ لڑائی جھگڑے اور فساد کا سبب ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس کی ذمہ داری لگائی کہ وہ ایک حق آشنا معاشرہ قائم کرے مگر اس کے برعکس ایک ایسا معاشرہ تشکیل ہوا جس میں روز بروز جنگ وجدل اور برائیوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور اخلاقی قدریں پامال ہو رہی ہیں۔

''جاگتے خواب کے دوران''

''اے خدا! چار جانب یہ کیسا دھواں ہے؟''
''ایک آواز
جو دُور تک اِک سفر میں رہی ____!
گونجتے فاصلوں کے سمندر میں چیخوں کا طوفان ہے
اور اندھیرے میں آواز چنگاریوں کی طرح''
''اور یہ کون ہیں؟ اے خدا
ایسی مخلوق میں نے ابھی تک سنی ہے نہ دیکھی
یہ مکروہ چہرے یہ جسموں کی بدبو
مری عمر چالیسویں سال میں ہے
مگر آج میں نے یہ منظر جو دیکھا ہے، پہلے سنا اور نہ دیکھا''
''اپنی آنکھوں کی گہرائیوں میں گناہوں کی حرکت لیے
زرد چہرے پہ جو کچھ ہوا۔۔۔ ہو چکا، اے خدا
(اس کا افسوس ہے)
اپنے ہونٹوں پر مٹنے مٹانے کے لمبے فسانے؛
اور اپنے سوا، اے خدا!''
''اپنے سب ساتھیوں کو مٹانے کی باتیں، بہانے''
یہ بکھرے ہوئے لوگ اِک دوسرے سے جدا
اے خدا!
ان کو دُنیا میں بھیجا گیا تھا، بتایا گیا تھا
یہ دُنیا، زمین آسمان، (اور کیا کیا گنوں)
اے خدا!
ان سے وابستہ رہنا

سدا ان اندھیروں میں پتھر سے پتھر رگڑ کر
اُجالوں کو تخلیق کرنا
اُجالوں کو گلیوں، گھروں، بستیوں میں
جہاں تک نظر جائے
(شہروں میں بھی) بانٹ دینا
یہی ایک پیغام ہے، جاوِداں ہے''
خدا!___ اے خدا!
میں نے جب رات بھر پاگلوں کی طرح
ان کتابوں کی سطروں کو چوما
(سمجھنے کی ناکام کوشش میں)
کچھ بھی نہ پایا___ تو پایا
زمیں تنگ ہے، آسماں دُور ہے
اے خدا___ اے خدا
آج کیوں رات بھر، پاگلوں کی طرح میں نے سوچا''
مگر لوگ اپنے لبوں پر لہو
اپنی آنکھوں میں غصے کا خوں
اور چہرے دہکتے ہوئے لال سے
گویا لوگوں نے ہر عیب کی سرخیاں
اپنے ہونٹوں پہ آنکھوں میں، چہروں پر مل لی ہیں
اور آسمانی جلالت فراموش کر دی گئی ہے
مگر لوگ بے خوف ہیں۔۔۔ اے خدا؟''

مراتب اختر ایک محبِّ وطن انسان تھے اور ان کے دل میں یہ جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ان کی شاعری میں بھی جگہ جگہ اس جذبے کی عکاسی نظر آتی ہے، جس کی خوبصورت مثال ان کی نظم ''دُعا'' ہے۔ اس نظم میں مراتب اختر نے ان لوگوں کی تصویر کشی کی ہے جو علیحدہ وطن کے خواہش مند تھے۔

دُعا

درگاہوں کو
میں چوموں ان درگاہوں کو
ان پیڑوں، جھیلوں راہوں کو
ان سے مجھ کو ان لڑتے ہاتھوں، ڈھالوں کے ٹکرانے کی
شمشیروں کے بھڑ جانے کی
جھنکار سنائی دیتی ہے
ان میں مجھ کو، وہ بھاگتے گھوڑے، روندتے رستوں ٹیلوں کو
طے کرتے میلوں برسوں کو
ہر آن دکھائی دیتے ہیں
کرن میں مجھ کو ان آہوں کی
راتوں کے اندھیروں میں چھپ چھپ کے روتے سچے لوگوں کی
آواز سنائی دیتی ہے
وہ جذبے، وہ انسان دکھائی دیتے ہیں
جو اس مٹی کی جان بنے
جن کے ہونٹوں پر ایک دُعا تھی مولا!
پاکستان بنے

حب الوطنی کا یہ تقاضا ہے کہ دیس کے ہر فرد اور مٹی کے ذرّے ذرّے سے پیار کیا جائے۔ مزدوروں، کسانوں، کھیتوں، کھلیانوں، دریاؤں اور پہاڑوں سے بھی محبت اتنی ہی ضروری ہے جتنی اپنے آپ سے۔ مراتب اختر کی وطن سے محبت شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ وہ اپنی شاعری میں بھی اس کا اظہار کرتے ہیں، انھوں نے زندگی کا زیادہ تر عرصہ گاؤں میں گزارا اور گاؤں کے باسی کھیتوں سے

محبت کیسے نہ کریں، مراتب اختر کی نظم ''کھیتوں کا گیت'' جہاں دیہی منظر کشی کی عمدہ مثال ہے وہاں کسانوں اور کھیتوں کے گہرے تعلق کی بھی آئینہ دار ہے۔

''کھیتوں کا گیت''

اے سرما کی جم جانے والی راتو، دیکھو!
پانی ندی ندی آیا
کھیتوں کو یہ پانی پہناؤ
کھیتوں کو اُجالے پہناؤ
لو بادل برسے۔ برس چکے
لو چلی ہوائیں۔ بیت گئیں
لو سورج نکلا ___ ڈوب گیا
یہ دھوپ غذا ہے کھیتوں کی
یہ پانی پیاس ہے کھیتوں کی
ان سرد ہواؤں کے دم سے
ان گرم ہواؤں کے دم سے
پکتی ہے جوانی کھیتوں کی
رُت آئی سہانی کھیتوں کی
اب نظر نظر سونا ہے
سورج نکلا، سونا کاٹو،
اب کس بات کا رونا ہے

اچھی شاعری کی یہ خوبی ہے کہ وہ دل اور دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہے۔ مراتب اختر کی شاعری میں بھی یہ خوبی موجود ہے ان کی آزاد نظمیں قاری کو بہت متاثر کرتی ہیں اس کی ایک مثال ان کی ایک نظم ''لمحے گزر رہے ہیں'' ہے جو اپنے اندر متاثر کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی ہے۔

''پیڑوں کی سنگتیں،
ہم نوا پرندوں کے چہچہے،
جنگلی ہواؤں کے شور،
از خود کھلے ہوئے پھول،
دو کناروں کا ساتھ دیکھو!
مجھے، یہ میں آج تم سے کتنا قریب ہوں ایک بار دیکھو!
یہاں سے ہم، اس تمام دُنیا کو چھوڑ کر
لوٹ جائیں گے پھر، جہاں سے آئے تھے۔۔۔منٹگمری''

صرف یہی ایک مثال نہیں بلکہ ان کی کئی نظمیں اس صلاحیت کی حامل ہیں اور پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہیں اس کی ایک اور مثال یہ بھی ہے۔

''دِل دھڑکتے ہیں
چراگاہوں کی جانب بڑھ رہی ہیں آہٹیں
جن میں پرندے چہچہاتے ہیں
جہاں بادل برستے ہیں
جہاں ٹھنڈی ہوائیں لہلہاتی گھاس ہے،
۔۔۔خاموشیاں ہیں، پھول ہیں، تالاب ہیں،
بستی جہاں سے دُور ہے اور آسماں نزدیک ہے
ہر سال ساون میں جہاں بادل برستے ہیں''

لاہور پاکستان کا دل ہے اور زندہ دلانِ لاہور کی زندہ دلی بھی مشہور ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس شہر کے دامن میں خون آلود لمحے بھی ہیں اور بارُود کے زہریلے اثرات کو بھی سمو رکھا ہے۔ شہر جوں

جوں بڑے ہوتے جاتے ہیں وہاں پہ فیکٹریاں ملیں اور کارخانے بھی لگائے جاتے ہیں اور یہ مشینی زندگی مکینوں کو بے حس مشین بنا دیتی ہے، مراتب اختر نے زندگی کا کچھ عرصہ زمانہ طالب علمی کے دوران لاہور میں گزارا۔ اس شہر سے اور اس کے باسیوں سے انھیں محبت ہوگئی مگر انھیں ان کی بے اعتنائی اور خود غرضی کا بھی شکوہ رہا جس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

''اس شہر کہ جس کی جھولی میں
تاریخ کے خوں آلودہ لمحے دولت ہیں
شاہوں کی جلالت، سطوت اب بھی زندہ ہے
اس شہر کہ جس نے زہر بھرا بارُود بھرا منصور ستمبر سر پر سہا
میں جب بھی یہاں آتا ہوں اپنے گاؤں سے
ڈر جاتا ہوں
اے جاگتے گھنے درختو! ____ میں ڈر جاتا ہوں
سیاحوں اُونچے اُونچے میناروں کو،
بھاگتے لوگوں کو
ایک دوسرے کو کھاتے، بے خوف درندوں کو،
جب دیکھتا ہوں ڈر جاتا ہوں
اب آؤ واپس لوٹ چلیں
اے سوچتے گھنے درختو آؤ!
آؤ! واپس لوٹ چلیں''

مراتب اختر کی شاعری کی یہ خوبی ہے کہ انھوں نے جہاں تکنیکی لحاظ سے نئی نظم کو جدت سے روشناس کروانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ وہاں موضوعاتی لحاظ سے بھی نام پیدا کیا۔ ان کے کلام میں امیجری کے بہت خوبصورت نمونے موجود ہیں ان کی نظم گمراہیاں امیجری کی اہم مثال ہے:

''مُعبّر رات عجیب اندھیرا تھا

میں جاگ رہا تھا
نیند نے مجھ کو ہر جانب سے گھیرا تھا
اِک وحشت میرے سارے جسم پر طاری تھی
اب کیسے تمہیں بتاؤں مُعبّر! برف کی صورت جسم پگھلتا جاتا تھا

اِک آگ میں جلتا جاتا تھا
اس پاگل پن کے جاگتے سوتے لمحوں میں
میں نے، کیا کچھ پایا کیا کھویا کیا دیکھا
اس رات کی جل تھل نیند میں جو کچھ دیکھا
میرے ذہن میں شاید دن بھر رہتا ہوگا
معمور تھے منظر جسموں کی عریانی سے
پانی سے طوفان اُبل اُبل کر سرد ہوئے
اور سارے منظر گرد ہوئے
پھر اک اِک لڑکی ساتھ لیے گھنگھور اندھیرا بیت گیا
دَر باز ہوئے، سورج نکلا، میں جیت گیا
کیا خواب تھے کہنہ سال مُعبّر!
اب بھی ذہن پہ طاری ہیں
جیسے یہ منظر میرے چاروں جانب اب بھی جاری ہیں''

مراتب اختر کا تعلق خاندانِ سادات سے تھا اور ان کا سلسلۂ نسب سیّد سید علی گیلانی، غوث بالا پیر اور شاہ چراغ لاہوری سے ہوتا ہوا غوث عبدالقادر جیلانی تک جا پہنچتا ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں تصوفانہ باتیں گھنگھرو دھمال، درگاہ، لنگر، زائر اور قوالی کا ذِکر بھی ملتا ہے۔ ''الغوزوں کی

آواز'' میں یہ سارے منظر نظر آتے ہیں:

''الغوزوں کی آواز
یہ گدلے جڑے جڑے سے بال
''علی رہندا اے دم دم نال''
دمادم مست قلندر لال

یہ ہر دم میلے کا سا منظر
زائر آئے نگر نگر سے
یہ زائر آئے اِدھر اُدھر سے
شانوں پہ مہریں شہباز قلندر والی
آنکھوں میں اِک جاگتی لالی
''بیر اگن، کشتے، عاصے، کنٹھے''
اور اِک اِک اُنگلی میں رنگین مقدس پتھر
پاؤں میں گھنگھرو
اب چھنن چھنن چھن چھنکتے گھنگھرو اور لگی سُر تال
ہجوم ـــــ دھمال
دمادم مست قلندر لال
ملنگوں کے نعروں کا شور
یہ زائر دِیے جلانے آئے
مرادیں دل کی پانے آئے
زمیں سے آسمان تک حیدر حیدر کے نعروں کی دھوم
پھیلتا جاتا ہے طوفان کی طرح ہجوم
ہوا منہ زور

گھٹا گھنگھور
ملنگوں کے نعروں کا شور
تلے دریا، چوٹی پر گنبد، گنبد کے چوگرد اندھیرا
اُمڈی سرخ سانولی رات
سجا کر جذبوں کی بارات ——
بجے گھڑیال
ہجوم —— دھمال
دمادم مست قلندر لال

لنگر تقسیم ہوا
اَن پانی سے اب فارغ ہوئے ملنگ
چِھڑی آوازوں اور خاموشی میں اِک جنگ
نشے سے تیر گئے ماحول میں
دم دم ''ناد'' بجے اور ناچنے لگے ملنگ
اندھیری رات —— اندھیری سرخ سانولی رات میں
جاگے حجرے حجرے ''مچ''
''جتی شہباز قلندر سچ
نکالو اپنے دل کے شک
جتی شہباز قلندر حق''
سدا جھولے یہ جھولن لال
تمہارے ہاتھ ہے —— رکھیو لاج میری پت لال
دمادم سیون کے، سندھڑی کے
جتی شہباز قلندر لال
دمادم مست قلندر لال

درگاہوں پر اس طرح کے مناظر بھی دکھائی دیتے ہیں جہاں اُلجھے بالوں والے بابے رقص کرتے دکھائی دیتے ہیں،لوگ درگاہوں پہ منتیں ماننے جاتے ہیں اور ''علی علی'' کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ان کی ایک اور نظم ''اے اُلجھے ہوئے بالوں والے بابا'' ان مناظر کی عکاسی کرتی ہے۔

''اے اُلجھے اُلجھے بالوں والے بابا!
اپنے الفے کو لہراؤ چھنکو چھنن چھنن
رقص کرو پھر رقص کرو''
درگاہ یہ بڑی پُرانی ہے
یہ تکیہ یہ تالاب یہ برگد یہ حقے
یہ کائی لگے پیالے یہ پینے والے
اُلجھے اُلجھے بالوں والے، بڑے پُرانے ہیں
مشہور زمانے بھر میں اس درگہ کے اَمر افسانے ہیں
''جو چومے اس درگاہ کی چوکھٹ
اُس کے سب دُکھ درد مٹے
سب اس کی مصیبت ٹلی ٹلی
ہر سمت برابر علی علی''
درگاہ کے چاروں سمت برابر علی علی
اس نام سے اِک اِک مشکل حل ہو جاتی ہے
یہ نام تو اپنا ازل ازل سے ساتھی ہے
جبرئیل سے اس درگاہ پہ آتے جاتے ہیں نوکر بن کر
اِس نام کا نور دمکتا رہتا ہے گھر گھر
''پھر رقص
اے اُلجھے اُلجھے بالوں والے بابا! اُمڈو

رقص ـــــ پھر رقص کرو‘‘

’’یہ رقص تو بیٹا! جب دل پر
درگاہ کا سچا عکس پڑے، درگاہ کی ہیبت طاری ہو
اِک عشق کی موج اُٹھے دِل سے جو اَبد اَبد تک جاری ہو
ہم ناچتے ہیں
جب طوفاں دل میں جاگتے ہیں
ہونٹوں پہ اِک یہ درد لیے
دم، حیدر حیدر علی علی
ہم ناچتے ہیں
ہر سمت برابر علی علی
ہم ناچتے ہیں

نئی لسانی تشکیلات کی تحریک نے اُردو شاعری میں روایتی ڈِکشن سے ہٹ کر ایک نئے ڈِکشن کو جنم دیا اگر چہ اس سے قبل بھی دوسری زبانوں کے الفاظ اُردو شاعری میں شامل رہے مگر ۱۹۶۰ء کی اس تحریک کے بعد اس جانب رجحان بڑھنے لگا۔ مراتب اختر نے اپنی شاعری میں انگریزی الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا اور اس انداز سے کیا کہ شعر کے حسن میں بھی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ انھوں نے انگریزی کے ساتھ ساتھ فارسی، عربی اور پنجابی کے الفاظ بھی استعمال کیے ان کی نظموں میں سے چند نمونے اس کی مثال ہیں۔

’’جاگتے خواب کے دوران‘‘

اے خدا
جب برسنے لگی بدلیاں
دُور تک سب مکاں بھیگتے ہیں

(بہت ٹیڈئس مسئلہ ہے) ص:۳۸

نظم ''پتھر'' دیکھئے:

ان گرجتے ہوئے گھنگھور زمانوں میں کہیں
میرا بدن، میری پریذنس، نہیں کچھ بھی نہیں (ص:۹۸)

نظم ''مجبوری'' دیکھیے:

بجھ گیا دیپ
جلی یاد کوئی
ذہن میں گھوم گئے
یوکلپٹس کے گھنیرے سائے
میں نے جانا ہے کہیں
آج بارش نہ رُکے گی شاید'' (ص۶۴)

مراتب اختر کی شاعری میں انگریزی کے ساتھ ساتھ جن دوسری زبانوں کے لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ان میں ہندی خاص طور پر قابلِ ذِکر ہے:

چڑیلیں کھول رہی ہیں بال
اندھیری رات ہے چاروں اور
گھٹا گھنگھور، ڈھول کی تال

(ص:۱۷۰)

ایک اور نظم میں دیکھئے:

یہ سندر سا نو لے ماجھی
جنھیں پرھول سندر بن نے پالا ہے
سمندر کی ہواؤں، تند طوفانوں نے مِل کر جن کو پالا ہے

میری دُنیا کو جن کی سانولی سندر صداؤں سے اُجالا ہے''

(ص: ۱۹۷)

لسانی تشکیلات کی تحریک سے متاثر مراتب اختر کی نظموں میں انگریزی اور ہندی کے علاوہ عربی اور پنجابی کے لفظ بھی آتے ہیں جو موقع کی مناسبت سے بوجھل محسوس نہیں ہوتے بلکہ نظموں میں خوبصورتی پیدا کرتے ہیں۔ اس کی خوبصورت مثال اس نظم میں دیکھئے:

''درگاہ کے چاروں سمت برابر علی علی
اس نام سے اِک اِک مشکل حل ہو جاتی ہے
یہ نام تو اپنا ازل ازل سے ساتھی ہے
جبرئیل سے اس درگاہ پہ آتے جاتے ہیں نوکر بن کر
اس نام کا نور دمکتا رہتا ہے گھر گھر'' (ص: ۱۲۴)

ایک اور نظم میں دیکھئے:

''ہونٹوں سے مٹی پونچھ کر
دامن سے اپنی انجھلیوں کو جھاڑ کر،
گیتوں میں اپنے دل سمو کر، دُور تک
چھا جائیں گے ساون کے کالے بادلوں کی طرح'' (ص: ۱۳۷)

مراتب اختر اپنے دور کے نامور شاعروں میں سے ایک ہیں۔ ان کی شاعری کا اسلوب جدیدیت کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے جدید اُردو نظم میں بھرپور حصہ ڈالا، ان کی شاعری کا فکری مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے تصوف، رُوح اور شخصی احوال و آثار کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ فنی لحاظ سے ان کا اسلوب اور تکنیک اس بات کی آئینہ دار ہے کہ بلاشبہ وہ ایک قادرالکلام شاعر ہیں اور اُردو نظم میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

حوالہ جات

۱۔ محمد زکریا، خواجہ، ڈاکٹر، گزرا بن برسے بادل، مقدمہ ص، ادارہ صوت ہادی، دسمبر ۲۰۰۴ء

۲۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، گزرا بن برسے بادل، فلیپ

باب ہفتم

مراتب اختر معاصرین کی نظر میں

مراتب اختر معاصرین کی نظر میں

مراتب اختر نے ساٹھ اور ستر کی دہائی میں اپنے منفرد ڈکشن کی بنا پر شہرت حاصل کی۔ انھیں مجید امجد کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع بھی مِلا۔ مجید امجد سے اُن کی ملاقاتیں بھی اُن کے جدید شعری رجحان کا سبب بنیں۔ مجید امجد مراتب اختر کے بارے میں کہتے ہیں:

> یہ ایک شاعر ہیں جو غزل کہتے ہیں اور غزل ان کے عقیدۂ حیات کا ایک جزو ہے۔ یہ عقیدہ ان کی رُوح کے لیے شرط ایمان ہے، کوئی عجب شیفتگی ہے جو انھیں اس صنف کے ساتھ ہے۔ ایک عمر سے وہ غزل کے مصنوعی انداز کو نکھارنے میں مصروف ہیں۔ یہاں ان اشعار کے اندر ایک بالکل نیا چہرہ مفاہیم ہے۔ لذتِ بیان کی ایک انوکھی سرشاری ہے۔ بظاہر ایک سہمی ہوئی آواز ہے لیکن دراصل یہ اپنی ہی توانائی سے شرمائی ہوئی آواز ہے۔ نئے اِمکانات اظہار ہیں، نیا جلوۂ حروف ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اظہار کے پردے میں شاعر اپنے آپ ہی سے مخاطب ہے۔ خود ہی اپنی آواز، خود ہی اس کا سننے والا اور خود ہی اس سے کیفیت گیر ہے۔ ان اشعار پر مکاشفوں کا گمان ہوتا ہے۔ اپنے تاثر پر اپنا اعتقاد، اپنے اعتقاد پر اپنا ایمان، اپنے اسی اطمینان کا وقار، ان کے ہر شعر سے جھلکتا ہے۔ جا بجا ایک ضبط ہے جس کی اپنی تمکنت ہے۔ ایک شکستگی ہے جس کا اپنا جلال ہے۔ ایک کرب مجبوری ہے، جس میں گراوٹ نہیں متانت ہے۔ ایسا احساس ہوتا ہے جیسے محبوب کے ساتھ بات کرتے وقت شاعر کے لہجے میں محبوب کا انداز رضامندی اس میں شامل ہو گیا ہے۔۔۔ جہاں خارجی اشیاء کا بیان ہے، وہاں یوں لگتا ہے جیسے یہ اشیاء اپنا ٹھوس وجود رکھتے ہوئے بھی بے جسم ہیں اور شاعر کے شعور کا حصہ ہیں جسم کے باہر جس قدر موجودات ہیں ان کی حقیقت و ماہیت خود شاعر ہی کے احساس کا پیکر ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ ساری دُنیا اس کی رُوح کا لباس ہے۔ (۱)

مراتب اختر کے معاصرین میں ایک اہم نام جعفر شیرازی کا ہے۔ جعفر شیرازی نے مراتب اختر کی شخصیت کا بطور شاعر اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> مراتب اختر ایک نہایت چپ چاپ شاعر تھا۔ ایک بہت بڑا شاعر، جس نے کبھی اپنی ذات کے خول سے باہر نکل کر نہ دیکھا لیکن زمانہ اس کا معترف رہا۔ اب جوں جوں زمانے گزرتے جا رہے ہیں مراتب بلندیوں سے بے داغ نور کی طرح اُتر رہا ہے اور وسعتوں میں ہزار رنگ بھر رہا ہے جیسے اس نے خود ہی کہا تھا۔

بلندیوں سے وہ بے داغ نور اُتر آئے
ہزار رنگ تہی وسعتوں میں بھر آئے (۲)

مراتب اختر کے معاصرین میں اشرف قدسی کا نام قابلِ ذِکر ہے۔ اشرف قدسی اُن کے بچپن کے دوست اور ہم جماعت تھے۔ انھوں نے مراتب اختر کے ساتھ بہت سا وقت اکٹھے گزارا۔ اشرف قدسی اپنی یادوں کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے مراتب اختر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> وہ جب بھی ملتا انتہائی محبت، خلوص اور پُر جوش انداز میں ملتا تھا انتہائی سادہ مزاج شخص۔۔۔ جس میں پیرزادوں کی سی کوئی بھی ''خصلت'' موجود نہیں تھی۔ بس ایک سیدھا سادہ درویش منش انسان نہ شکل سے پیرزادہ دکھائی دیتا تھا اور نہ حرکات وسکنات سے۔ اس نے کوئی شوق بھی نہیں پال رکھا تھا۔ وہ صرف اور صرف شعر وادب کا متوالا تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ شاعری کے سوا کسی شے کا بھی رسیا نہیں تھا۔ حالانکہ ان دنوں نہ ہی مے نوشی پر کوئی پابندی تھی اور نہ ہی اُس کے پاس وسائل کی کمی تھی۔ اُس کے خاندانی مریدوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ زمینوں اور باغات کی آمدنی علاحدہ تھی، مگر اللہ کا یہ اُس پر خاص احسان تھا کہ مرتے دم تک اُس کی آنکھوں میں شرم وحیا قائم رہی۔ میرے نزدیک وہ ایک شرمیلا نوجوان تھا اور زمانے کی عیاریوں سے ناآشنا بھی۔ اُس کی شخصیت کا یہی رنگ اُس کی شاعری میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ عورت یا محبت کی باہمی رشتے سے ناواقف تھا۔ وہ بھی ایک انسان تھا

اور محبت بھرا دِل رکھنے والا انسان۔۔۔مگر اپنی پاکیزگیِ طبع کی وجہ سے وہ ہمیشہ دوسروں سے جداگانہ دکھائی دیتا تھا۔

مراتب اختر کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ اِردگرد کے حالات کے ساتھ ساتھ دُنیا کے حالات پر بھی گہری نظر رکھتا تھا۔ وہ ایک وسیع المطالعہ شخص تھا۔ ملکی اور غیر ملکی سیاسیات سے پوری طرح آشنا۔۔۔اس کی شاعری میں اس کے دور کے حالات سب سے نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ (۳)

مراتب اختر کی شخصیت ایسی تھی کہ کوئی بھی ملنے والا اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اُنھوں نے اپنے اخلاق، کردار اور رویے سے معاصرین کے دِلوں میں بھی گھر کر رکھا تھا۔ قیوم صبا مراتب اختر کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

مراتب اختر اپنی روزمرہ زندگی اور اعمال میں اپنے عزیزوں، اپنے دوستوں، اپنے بڑوں، اپنے چھوٹوں، اپنے عقیدت مندوں اور سراپا احترام ارادت مندوں، اپنے حاسدوں، غرض پسندوں، معاشرے کے بڑے سے بڑے صاحبِ حیثیت لوگوں اور معاشرے کے گرے پڑے بے بہرہ مفلوک و مفہور لوگوں، ہر طرح کی خارجی داخلی متعدد و مختلف سطحوں سے منسلک لوگوں سے ملنے اور بچھڑنے میں اپنی سادگی اور سچائی اخلاص اور دردمندی، بے تکلفی اور بے ساختگی، آسانی اور روانی کے عمل میں اس طرح سانس لیتے تھے جیسے مچھلیاں دریا میں اور پرندے فضا میں۔ اپنے آپ میں اور اپنے سے باہر سارے بندوں اور بندیوں ساری چیزوں اور منظروں اور واقعوں سے ایک معصوم فطری ہم آہنگی حاصل کیے رکھنا مراتب اختر کی شخصیت اور شاعری کا عظیم ترین جوہر ہے شخصیت اور شاعری میں یہ جوہر کس طرح موجود تھا اور اس جوہر کی تخلیق کہاں سے ہوئی تھی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مراتب اختر نے سچ اور جھوٹ اور نیکی اور بدی کے فرق کو سمجھنے میں زندگی کی ساری شکلوں اور سارے رنگوں کو پوری طرح جذب اور قبول کرنا اختیار کیا تھا اور یہ اختیار کسی طرح کے خارجی دباؤ اور تقاضوں کے زیرِ اثر عمل میں نہیں آیا تھا بلکہ ان کے وجود کی اصل حریت اور آزادی کا اظہار تھا۔ (۴)

مراتب اختر کی شخصیت ایسی تھی کہ اُن سے ملنے والوں کے ساتھ ساتھ اُن کے عزیزو اقارب بھی اُن کی زندہ دلی اور حُسنِ اخلاق کے گرویدہ تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی اور معروف پنجابی شاعر سیّد افضال حسین گیلانی اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> میں نے جذبوں کی صداقت کا سبق اپنے بھائی جان سے سیکھا جن کا اخلاص بھائیوں، رشتہ داروں، دوستوں اور عام ملنے والوں کے ساتھ ہمیشہ یکساں رہا اور یہ حقیقت اُن کو جاننے والے تو جانتے ہی ہیں۔ پڑھنے والے اُن کا کلام پڑھ کر جان لیں گے۔ حفظِ مراتب مانع ہے اس سے آگے کچھ نہ کہو، اگر حسبِ مراتب نہ کہہ سکے تو ادب نہ رہے گا۔ (۵)

مراتب اختر کے معاصرین میں اہم نام ناصر شہزاد کا ہے۔ ناصر شہزاد مراتب اختر کے ماموں زاد بھی تھے اور پھوپھی زاد بھی۔ وہ اپنے دور کے نامور شاعر اور معروف نقاد تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہندی الفاظ کے امتزاج سے نیا ڈِکشن متعارف کروایا۔ وہ مراتب اختر کے شعری مقام و مرتبہ کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مراتب اختر اُردو غزل کو شہر کی تنگ و تاریک گلیوں سے نکال کر شہر کے مرغزاروں اور خوش نما بازاروں کی طرف لے گیا۔ اُس نے غزل کو کچھ دیا جو اُس کے مشاہدہ اور اُس کے مطالعہ سے گزرا اب غزل میں گاڑیوں کا ذِکر بھی ہی اور پہاڑیوں کا بھی۔ اب اس میں کھیتیاں اور کھلیان بھی کھلتے ہیں اور ندیوں پر کامینوں کے اشنان بھی، ریل کے چلنے کی آواز بھی ہے اور قہوہ خانوں میں بجتے ہوئے ساز بھی۔ مراتب اختر نے غزل کو بڑی طہارت اور بڑی تابندگی عطا کی ہے اُس نے اِس کے رنگ اور خیال کی نئی جہتوں اور جمال کی نئی رہتوں سے ہمکنار کیا ہے۔ (۶)

پروفیسر سیّد ریاض حسین زیدی بھی مراتب اختر کے معاصرین میں شامل ہیں۔ نعت گوئی اور غزل گوئی میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ''ادب سرائے'' کے زیرِ اہتمام ماہانہ محفلوں کا انعقاد کر کے عرصۂ دراز سے ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اُردو ادب کے اُستاد اور نقاد ہیں۔ مراتب اختر کی

شاعری کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

مراتب نے کائنات کے حسن ونظر کی چھوٹی چھوٹی بظاہر غیر اہم اور بے اعتنا باتوں کو بھی اعجاز آفرین انداز میں داخلِ حصار شعر کیا ہے کہ ہر شعر بولتا ہے اور اپنا جادو جگا دیتا ہے۔ مراتب اختر کسی طور بھی ایک روایتی شاعر نہیں اور لفظوں کی آڑی ترچھی لکیریں اپنی ''لیاقت'' کے بل بوتے پر کھینچتے ہوئے بڑا شاعر کہلوانے کا روادار نہیں۔ اُسے جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ اپنے اندر جھانک کر اُسے پرکھتا ہے یا جو کچھ اس کے داخل میں وقوع پذیر ہوتا ہے اُسے احساس اور ذہانت کی دلنشین آمیزشوں اور لفظوں کے خوشنما بندوبست کی تمام تر نفاستوں سے ہم آہنگ کر کے اپنے شعری تجربات ہمارے رُوبرو کر دیتا ہے۔ اُسے ردیف اور قافیہ کی تنکنائیاں ''بپاس خاطرِ ادب'' قبول ہیں لیکن ان اوگھٹ گھاٹیوں سے گزر کر بھی وہ نہایت تروتازہ، جدید اور کھری کھری صداقتوں کی آئینہ داری کرتا ہے۔'' یوں اس کی فنی پختگی اس کا اُجالا من ظاہر کرنے میں کوئی دِقت محسوس نہیں کرتی۔ اُس کے ہاں کذب، تضاد اور تشکیک کے مراحل کا گزر نہیں۔ وہ سچائیوں کو ادبی بانکپن اور شعری حسن آفرینی کے ساتھ ہمارا ہم ذوق بنا دیتا ہے۔ اس ضمن میں وہ پہیلیاں نہیں بوجھتا اور کج فہمی اور بے ربطی کے خرمشے چھوڑ کر اپنی بدیسی دانش'' کی دھوم نہیں چھوڑتا۔ اُس نے اپنے تجرباتِ شاعری کو اسی مٹیوں مٹی زمین میں رچ بس کر یوں بے ساختہ رُوپ میں ہدیہ قارئین کیا ہے کہ فطری واہ واہ کی بار بار تکرار نہایت لطف دیتی ہے۔ وہ فراق، بے دردی، کسک، ظلم و جور، بے مہری، کج ادائی، ستم ظریفی اور اسی نوعیت کی اَن گنت، ہڈ بیتیاں'' فرفر انداز میں ہمارے اندر اُتارتا جاتا ہے کہ یہ سرسری کیفیتیں اپنے اعجازِ شعر سے اپنے سوز و ساز اور کیف و کم کے لذائذ سے ہمیں مالا مال کر دیتی ہیں۔ اصل شاعر اپنا آپ بے روک ٹوک رُوپ میں ہمارے رُوبرو کر دیتا ہے اور ہم اِس رُوپ میں سے اپنے آپ کو بے رد و قدح طشت از بام دیکھ کر اُس سے یاری پکی کر لیتے ہیں۔ (۷)

مراتب اختر کی بے وقت موت سے جہاں اُن کے اہلِ خانہ، مریدین اور عزیز و اقربا رنجیدہ تھے وہاں

ادبی حلقوں میں بھی صفِ ماتم بچھ گئی اور نامور شعراء نے اُن کی موت پر منظوم اظہارِ عقیدت پیش کیا، جس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

سیّد مراتب اختر کی یاد میں

طالب جتوئی۔ ساہیوال

صبحیں اُداس ہیں سبھی شامیں اُداس ہیں
احباب کی تیرے لیے رُوحیں اُداس ہیں
اُٹھتی ہیں جس طرف بھی نگاہیں تیرے بغیر
جہتیں اُداس ہیں ، سبھی قوسیں اُداس ہیں
دیتی ہیں تیرا زندہ حوالہ جو وقت کو
شہرِ اَدب میں آج وہ غزلیں اُداس ہیں
منسوب ہیں جو اَب بھی یہاں تیرے نام سے
اُلفت ، خلوص ، پیار کی رسمیں اُداس ہیں
محفل میں تو نہیں ہے تُو شاید اِسی لیے
اِس چاندنی میں چاند کی کرنیں اُداس ہیں
طالبؔ! مراتب ایسے قلندر کی یاد میں
یہ دِل اُداس ہے یہ نگاہیں اُداس ہیں (۸)

میری نظر میں مراتب اختر کا فنِ سخن

ڈاکٹر کاظم بخاری

روشنی ماہتاب و کہکشاں
تاب انجم زینتِ کون و مکاں
رنگ و نور مہر ، خوشبوئے شمیم
گردشِ لوح و قلم ، بادِ نسیم
رونق کونین ، تزئین چمن
آب کوثر ، عطر گُل ، مشک ختن

واقعاتِ زیست ، شرحِ زندگی
وار داتِ دل ، حدیثِ آگہی
داستانِ ہجر ، رُو دادِ وصال
حادثاتِ عشق ، اذکارِ جمال
اِک پیامِ ربط ، رسمِ دوستی
اِک کلامِ صدق ، رنگِ آشتی
حاصل تخلیق فن ، حدِ کمال
منفرد انداز تابندہ خیال
فلسفہ ، حکمت ، ادب، فکر و سخن
شاعری کی شکل میں ہیں ضوفگن

حامِل آئینۂ فکر و ادب
معدنِ گنجینۂ شوق و طلب
شاعری ہے منفرد اسلوب میں
گفتگو ہے طالب و مطلوب میں
ہمہ اوصاف جہانِ رنگ و بو
ہیں مراتب تیرے فن میں ہو ہو
دے خدا فردوس میں تجھ کومقام
میرے ہم دم تجھ پہ کاظم کا سلام (۹)

گوہر ہوشیار پوری

اس عمر میں اِنتقال کر کے
کیا جلد گئے وصال کر کے
کس شہر میں کر لیا بسیرا
اس شہر کو پُرملال کر کے
یاروں میں شریک رہنے والے
بچھڑے نہ شریکِ حال کر کے
یہ کیا کہ نڈھال کر گئے تم
پھر چھوڑ دیا نڈھال کر کے
آ روک تو غم کی شدتوں کو
دیوار ''حصار حال'' کر کے
اللہ کی رحمتیں ہوں دائم
سیّد پہ نبیﷺ کی آل کر کے (۱۰)

جعفر شیرازی

منتظر ہوں تیرا اے جا کے نہ آنے والے
جانتا بھی ہوں کہ آتے نہیں جانے والے
تو کہ بیگانہ رہا عالمِ رنگ و بُو سے
یاد کرتے ہیں تجھے آج زمانے والے
تیری تربت پہ کوئی پھول کِھلا یا نہ کِھلا
اے خیالوں میں گلابوں کے پھول کھلانے والے
محفلِ شعر و سخن بعد تیرے ویراں ہے
قریۂ شعر میں اے دُھوم مچانے والے
اس طرح لوحِ زمانہ پہ تیرا نام ہے نقش
آپ مٹ جائیں گے یہ نام مٹانے والے (۱۱)

مراتب اختر کی یاد میں

ابوسلیمان رشیدی

رب دا خاص اِک بندہ سی
آکھن لوک فرشتہ سی
شعر ادب دا جانی جاں
رنگاں دا گلدستہ سی

عرفاناں دا قلزم سی
فیض دا وگدا دریا سی
اللہ جس نوں کرے پیار
نسبی ولی اللہ سی
وانگ بھراوآں مل بہنا
یاراں نال اِک رشتہ سی
اوہدی یاد دھنک وَرگی
ذِکر اوہدا ست رنگا سی
اوہدی صفت مراتب سی
سیّد نسلوں اعلیٰ سی (۱۲)

حوالہ جات

۱۔ مجید امجد، مراتب اختر کی غزلیں، ماہنامہ ادبِ لطیف، لاہور، مارچ، ۱۹۶۸ء

۲۔ جعفر شیرازی، مراتب اختر۔۔۔شخص وشاعر، ماہنامہ سجاد، ساہیوال/مانچسٹر، جنوری ۱۹۹۳ء

۳۔ اشرف قدسی، آہ سیّد مراتب اختر۔۔۔رفتید ولے نہ از دلِ ما، مشمولہ: نقدِ مراتب (عون الحسن غازی)، ادارہ صوتِ ہادی، اوکاڑہ، ۲۰۰۴ء، ص ۷۸، ۷۹، ۸۰

۴۔ قیوم صبا، ہمزاد، ماہنامہ سجاد، ساہیوال/مانچسٹر، جنوری ۱۹۹۳ء

۵۔ افضال حسین گیلانی، دیباچہ، گنج گفتار (مراتب اختر)، شیخوشریف: ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۲

۶۔ ناصر شہزاد، مراتب اختر، ماہنامہ سجاد۔

۷۔ سیّد ریاض حسین زیدی، سیّد مراتب اختر، ایک زندہ شاعر ـــــ ماہنامہ سجاد

۸۔ طالب جتوئی، ایضاً

۹۔ کاظم بخاری، ڈاکٹر، ایضاً

۱۰۔ گوہر ہوشیار پوری، ایضاً

۱۱۔ جعفر شیرازی، ماہنامہ سجاد

۱۲۔ ابوسلمان رشیدی، ایضاً

باب ہشتم

مراتب اختر کا ادبی مقام و مرتبہ

(نامور ادیبوں اور دانشوروں کی نظر میں)

مراتب اختر کا ادبی مقام و مرتبہ

نامور ادیبوں اور دانشوروں کی نظر میں

مراتب اختر کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے جدید شاعری میں ایک نئے رجحان کو متعارف کروایا اور اُن کے اس فن کی تمام ناقدین قدر کرتے ہیں۔ مراتب اختر کی شاعری کے رکھ رکھاؤ اور ڈِکشن کے حوالے سے معروف نقاد افتخار جالب لکھتے ہیں:

> مراتب اختر نے جو شاعری کی ہے اس میں رکھ رکھاؤ، ڈِکشن کی ملائمت، نفاست اور مروّجہ شعریت نہیں ہے۔ سب کچھ اُکھڑا اُکھڑا دکھائی دیتا ہے۔ یہ خرابیاں کہ اِمکان سے نابلد اندھے، اور بے مغز لوگوں کو گراں گزرتی ہیں، درحقیقت مراتب اختر کی خالص خوبیاں ہیں۔ ان خوبیوں سے مستفید وہی ہوسکتا ہے جو شعر کی منزہ صورت کو پہچان سکتا ہو۔ اِمکان کے اِمکانات تک جن کی رسائی نہیں ان کے لیے مراتب اختر کی شاعری کوئی لذت اور معنی نہیں رکھتی۔ اس شاعری کے لیے کہ اِمکان کے اِمکانات پر ایمان کو پہلی شرط قرار دیتی ہے، زندہ اور توانا ہونے کے ساتھ ساتھ شعر کو ڈِکشن کی موجودگی اور عدم موجودگی دونوں صورتوں میں پہچاننے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔
>
> مراتب اختر کی شاعری درحقیقت یہ تقاضا کرتی ہے کہ آپ بھی مراتب اختر ہوں۔ آپ کے اور اس کے اِمکانات یکساں نہیں تو مماثل ضرور ہوں تا کہ آپ یہ جان سکیں کہ کتنے ہی اِمکانات ہیں: حقیقت میں تبدیل ہوتے ہوئے، نئے اِمکانات کو ضم دیتے ہوئے: رائج الوقتی سے بے نیاز، نامراد و کامگار! کیا آپ اس تقاضے پر پورے اُترتے ہیں؟ اگر نہیں، تو نہیں، کبھی بھی نہیں، مگر نہیں شاید![1]

ڈاکٹر محمد زکریا اُردو ادب کے نقادوں میں اہم نام اور مرتبہ کے حامل ہیں انھوں نے کچھ عرصہ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں مراتب اختر کے ساتھ گزارہ اور دونوں ینگ رائٹرز میں کافی

مشہور رہے۔ مراتب اختر کی شاعری کے حوالہ سے ڈاکٹر محمد زکریا یوں رقم طراز ہیں:

> سیّد مراتب اختر نے اپنی غزلیات کو اظہارِ ذات کا وسیلہ بنایا اور اس قدر سچائی سے بنایا کہ اپنے تمام خیالات، احساسات، تخیلات، توہمات اور مشاہدات اس کی نذر کر دیے۔ ان کی غزلیات کو پڑھ کر ایک رنگا رنگ کہکشاں آنکھوں کے رُوبرو لرزنے لگتی ہے۔ ان غزلیات میں کہیں تو حُسنِ کائنات جلوہ گر ہوتا ہے۔ کہیں یہ حسن امیجری کا رُوپ دھار لیتا ہے۔ کہیں اشاریت اور علامت بن کر وسعت پذیر ہوتا ہے اور کہیں کائنات کے اسرار کی طرف سمت نمائی کرتا ہے۔ کائنات کا حسن پُراسرار اور اس کی پیچیدگیوں کے بارے میں مابعدالطبیعاتی سوالات بھی اشعار میں سے جھانکنے لگتے ہیں اور کبھی یقین اور کبھی شک دلوں میں پیدا کر دیتے ہیں۔ (۲)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری اُردو ادب کے معروف نقادوں میں ایک اہم نام ہے اور انھوں نے مراتب اختر کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا ہے بلکہ اُن کی کتاب ''جنگل سے پرے سورج'' کا فلیپ بھی لکھا۔ مراتب اختر کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> مراتب اختر نے نئے سماجی رابطوں سے بننے والا ڈکشن استعمال کر کے اپنے عہد کا شعور مہیا کیا ہے۔
>
> مراتب اختر نے خارج کو اپنے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ہاں خارجی دُنیا کی جو شکل بنتی ہے اس میں جنگل، پھول، نمدار گھاس، کیلے کے سبز پات اور بہار کے چمکتے خوشبودار دنوں کے ساتھ ساتھ سڑکیں، فٹ پاتھ اور شہر کی روشنیاں بھی موجود ہیں اور یہ نیا تہذیبی حوالہ غزل کے نئے شعور کا احساس دلاتا ہے جو طویل جمود کے بعد تجدیدِ حیات کے نئے ڈھانچے میں داخل ہو رہی ہے، اسی نئے حوالہ سے اس کا Psychic-make-up تشکیل پاتا ہے جس سے ہم اپنی شناخت کر سکتے ہیں۔ (۳)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا شمار اُردو ادب کی اہم شخصیات میں ہوتا ہے۔ وہ بطور شاعر اور نقاد

معروف نام ہیں۔ مراتب اختر کے قیام لاہور کے دوران گوہر نوشاہی اور مراتب اختر کا یارانہ مثالی رہا۔ وہ اپنی بچپن کی یادداشتوں کو ذہن میں لاتے ہوئے مراتب اختر کی شاعری کے حوالے سے یوں تحریر کرتے ہیں:

> میری طرح مراتب کو بھی رُوحانیت اور درویشی سے کچھ زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ پڑھنے لکھنے اور تخلیقی راستوں کی ٹوہ لگانے میں مگن رہتے تھے۔ ہنسی مذاق، گالی گلوچ، گلے شکوے اور شرارتیں سب اکٹھی ہوتی تھیں۔ مراتب اختر کے بغیر زندگی اس وقت بھی نامکمل تھی اور آج بھی نامکمل ہے۔
>
> ع ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
>
> مراتب اختر زمانۂ طالبِ علمی میں ہی بہت پختہ گو شاعر تھے۔ وہ مصرع تر کے شاعر نہیں تھے لیکن شعر میں اس قدر پختگی، ابلاغ اور کشش تھی کہ سننے والا داد دیئے بغیر نہیں رہتا تھا، مراتب اختر جس طرح خود زندگی سے لبریز تھے اُن کی شاعری بھی خلوص، سچائی اور انفاس تازہ سے مالا مال تھی۔ وہ غزل لکھتے تھے۔ غزل میں سوچتے تھے اور غزل ہی میں زندہ رہنے کی خواش رکھتے تھے۔ معلوم نہیں وہ کسی غزل یا غزال کو پا سکے یا نہیں لیکن ایسا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ یہ جمالیاتی اور تخلیقی کیفیت اُن کے اندر کہیں گم ہوگئی تھی جسے وہ اپنے اور اپنے آپ کو اس کے اندر دریافت کرنے میں لگے رہے۔ (۴)

معروف شاعر و نقاد ظفر اقبال بھی مراتب اختر کی شاعری کے معترف ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون میں اُن کی بے وقت موت پر لکھتے ہیں:

> چالیس سال ایک بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے، بلکہ اسے آپ نصف عمر بھی کہہ سکتے ہیں اور ان چالیس برسوں میں جدید اُردو غزل کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہے۔ مراتب اختر کے بارے میں اس وقت حضرات تبسم کاشمیری، گوہر نوشاہی اور افتخار جالب نے جو کچھ کہا تھا، اور، جس طرح کی توقعات اس سے وابستہ کی تھیں، اس عہد کی حد تک وہ بالکل ٹھیک تھا، لیکن بے وقت موت نے اُسے مہلت ہی نہ دی کہ وہ نت نئے اور بدلتے ہوئے

لہجوں کا ساتھ دے سکے۔''(۵)

ڈاکٹر انور سدید کی مراتب اختر کے حوالہ سے رائے یہ ہے:

مراتب اختر وہ شاعر گم گشتہ ہے جو اقلیمِ شعر میں اپنی بہار دِل فزا کے صرف چند جھونکے لہرا کر اچانک اس دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔ اس نے مجید امجد جیسے خرقہ پوش و پابہ گل شاعر کی دھرتی ساہیوال سے جنم لیا تھا۔ یہیں اپنی شاعری کے وہ چراغ روشن کیے جن میں اس کے دل کا روغن جلتا تھا اور پھر اچانک ایک روز یہیں پیوندِ خاک ہو گیا۔ اس کی شاعری کے دو مجموعے ''جنگل سے پرے سورج'' اور ''حصارِ حال'' اس کی زندگی میں شائع ہوئے تھے جن کے مطالعہ کے بعد شاعروں کے شاعر مجید امجد نے مراتب اختر کی شاعری کا تجزیہ کیا تو لکھا کہ ''غزل مراتب اختر کے عقیدۂ حیات کا ایک جزو ہے اور یہ عقیدہ ان کی رُوح کے لیے شرطِ ایمان ہے۔(۶)

صابر لودھی میونسپل کالج اوکاڑہ میں اُردو کے اُستاد تھے۔ اُن کی پہلی ملاقات مراتب اختر سے بطور اُستاد ہوئی تو بہت متاثر ہوئے۔ وہ مراتب اختر کے حوالے سے اپنی یادوں کے دریچوں سے جھانکتے ہوئے لکھتے ہیں:

آج بھی میں یہی سوچتا ہوں کہ اگر مراتب اختر میری کلاس میں نہ آتا تو میں غالبؔ کے اشعار کو سمجھنے کی کوشش نہ کرتا۔ تہہ در تہہ معانی تک نہ پہنچ پاتا۔ یہ تو اس کا خوف تھا جس نے مجھے غالبؔ کی عظمت کا گرویدہ بنا دیا۔۔۔ غالبؔ اور مراتب، دونوں مجھے ایک ساتھ یاد آتے ہیں اور میرا دعویٰ ہے کہ وہی اُستاد، اچھے اُستاد بننے کی کوشش کرتے ہیں جنھیں ذہین شاگرد میسر آئیں۔ اللہ مراتب اختر پر اپنی رحمتوں کی نوازش کرے۔(۷)

معروف نقاد ڈاکٹر ناہید شاہد نے مراتب اختر کی شاعری اور خصوصاً ''گنج گفتار'' کے حوالے سے ایک مضمون میں کہا ہے:

مراتب اختر جیسے تخلیق کار نہ کسی اخبار نہ کسی رسالے، نہ ریڈیو اور نہ ہی کسی مشاعرے میں

شرکت کے لیے شعر کہتے ہیں، بلکہ تخلیق کا یہ عمل اُن کے در و بام پر ہر لحہ وارد رہتا ہے اور وہ جنگل میں ناچتے مور کی طرح فطرت کی حُسن آرائیوں کا حصہ بنے ہوتے ہیں۔

نہ کسی داد کی طلب اور نہ کسی شہرت کی خواہش۔۔۔''گنجِ گفتار'' کے نام سے گزشتہ برس شائع ہوئی ایک کتاب دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں انداز و بیان کے رنگ بکھرے پڑے ہیں۔غزل کی تنگنائے میں پھول کھلے ہوئے ہیں جو نئے اور بالکل تازہ ہیں۔ریڈیو، کاز، پکنک، جین، سین، ریلنگ، گلاس اور اس جیسے دوسرے انگریزی الفاظ کا استعمال اگر کوئی اور کرتا تو شاید بات سطحی سی محسوس ہوتی لیکن یہاں تو یہ اُردو زبان ہی کا سرمایہ نظر آتے ہیں اور بالکل اجنبی نہیں دِکھتے۔

غزل ہی کے نازک اور من موہنے سراپے میں کشمیر، ویت نام اور رہوڈیشیا کی جلتی ہوئی تصویروں کے مناظر اگرچہ براہِ راست اظہار کے زمرے میں آتے ہیں لیکن مراتب اختر کی شاعری کا یہ اہم جزو لگتے ہیں۔یعنی اُن کی نظر دُنیا کی وسعتوں میں بکھری بدصورتیوں کو اپنے پیرائے میں لا کر ایک راست فکر فرد کی ذمہ داری نبھاتی ہے۔(۸)

مراتب اختر کے ساتھ زمانۂ طالبِ علمی میں گزارے لمحات کا ذِکر کرتے وحید اطہر لکھتے ہیں:

مراتب اختر اکثر غزلیں کہتا اور بہت عمدہ کہتا مجھے یاد نہیں کہ کوئی بھی بین الکلیاتی مشاعرہ ایسا تھا کہ جس میں مراتب اختر اوّل نہ آیا۔وہ درمیانے قد، گٹھے ہوئے جسم کا مالک اور انتہائی صحت مند نوجوان تھا اور اس تن و توش کے حوالے سے بھی وہ ہم سب پر حاوی تھا کہ باقی دوست منحنی جسم کے مالک تھے۔مراتب اختر کا خمیر مجید امجد اور ظفر اقبال کے دیس سے اُٹھا اس نے بھی غزل کو سینے سے لگائے رکھا اس نے بھی غزل کی پرانی ڈگر سے بغاوت کی۔اس نے بھی غزل میں نئے نئے تجربے کیے اور اس زرخیز سرزمین (ساہی وال) میں پیدا ہونے کا حق ادا کر دیا۔مراتب اختر کے ہاں گل و بلبل کی شاعری نہیں ہے۔وہ زمانے کے ساتھ ساتھ رہا۔اس نے دیومالائی قصے

کہانیوں کا سہارا نہیں لیا۔ وہ جیتے جاگتے ماحول میں زندہ رہا داخلی جذبوں کے ساتھ ساتھ خارجی حقیقتوں کا اظہار مراتب اختر کی غزلوں کا خاصہ ہے۔ (۹)

موجودہ دور کے معروف نقاد، نثر نگار اور شاعر زاہد حسن بھی مراتب اختر کی شاعری کے معترف ہیں اور وہ اس حوالہ سے لکھتے ہیں:

۶۰ء کی دہائی میں جن شعرا نے لسانیات، لفظیات اور ڈِکشن کے تجربے کیے، سیّد مراتب اختر ان میں سے ایک ہیں۔ وہ ان بہت سے شعرا میں سے ایک ہیں، جن میں سے بہت کم کا نام باقی رہ گیا ہے، ان میں سے نمایاں ترین نام سیّد مراتب اختر کا ہے۔ سیّد مراتب اختر کے یہاں جدید تر ڈِکشن کو استعمال کرنے اور کمال ہنر وری سے نباہنے میں دو باتیں کارفرما ہیں۔ پہلی بات ہے ان کی اپنی پوری زندگی کا تجربہ جس کے بڑے حصے میں غموں اور اندوہناکیوں کی تلخیاں گھلی ہوئی تھیں اور دوسری بات ہے ان کی مجید امجد، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، گوہر نوشاہی، خواجہ محمد زکریا اور ان جیسے دیگر ادباء و شعراء کے ساتھ دوستی۔ پھر ان کا نہ صرف معاصر شاعری کا مطالعہ گہرا نظر آتا ہے بلکہ فلسفہ، سماجیات اور دیگر رائج علوم کا گہرا مطالعہ بھی ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اپنی حقیقی صورتوں میں بھی اور فکری و معنوی شکلوں میں بھی۔

اِک میں اور اِک احساس مرا، قہوہ کڑواہٹ، آوازیں
اِک ریستوران کے کیبن میں اِک تنہا شام منائی ہے

ان کی شاعری کے حوالے سے یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ وہ واقعات اور وہ مناظر جو ان کی زندگی میں بہت کم دیر کے لیے ٹھہر سکے اور جن کی محض باقی نشانیاں ہی رہ گئی تھیں ان کو انھوں نے اس سلیقہ مندی کے ساتھ اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ شاعری کا ایک کمال یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی منظوم تاریخ کے طور پر اس جغرافیے اور وہاں کے لوگوں کے حافظے کا حصہ بن جائے۔ (۱۰)

عون الحسن غازی سیّد مراتب اختر کے بھانجے ہیں۔ بطور شاعر اور نثر نگار ادبی حلقوں میں جان پہچان رکھتے ہیں وہ مراتب اختر کے حوالہ سے، اُن کی شخصیت اور فن پر اپنے تاثرات یوں بیان

کرتے ہیں:

ماموں جی (مراتب اختر) کی یادیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں، میری ادب سے وابستگی ان کے رُوحانی مکاشفوں کا اظہار ہے جوان کی شاعری اور شخصیت میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ ان کی زندگی میرے لیے، میرے خاندان کے لیے، ان کے عزیز واقربا کے لیے، ان کے جاننے والوں کے لیے اور اگر میں یہ کہوں کہ زیست کے ہر مسافر، ہر راہی کے لیے روشن مشعل کی حیثیت رکھتی ہے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔۔۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان کی شاعری نئی اُردو شاعری کا اہم حوالہ ہے تو کچھ غلط نہیں ہوگا اور یہ کہوں کہ وہ اہلِ سادات اور گیلانی ہوتے ہوئے بھی زندگی کے مصائب ومسائل سے اُسی طرح گزرے، جس طرح ایک عام انسان گزرتا ہے تو کچھ غلط نہیں ہوگا اور پھر مصائب اور آلام تو ہمیشہ سے ہی انسانی زندگی کا جزوِلازم ہیں لیکن ان پر مطمئن رہنا ایک مردِقلندر ہی کا کام ہے۔ میرے ماموں اور میرے مرشد سیّد مراتب اختر بھی اپنے ابتدائی ایام میں ہی ان مصائب وآلام کا حصہ بن گئے۔ وہ ابھی گورنمنٹ کالج سول لائینز میں ہی زیرِتعلیم تھے کہ انھیں بعض نجی اور خاندانی مسائل کی بنا پر اپنی تعلیم اُدھوری چھوڑنا پڑی۔ ان مصائب وآلام کا ذِکر انھوں نے اپنے اکثر اشعار میں بڑے کھلے لفظوں کے ساتھ کیا ہے۔ سیّد مراتب اختر جو جدید اُردو غزل اور نظم کے اہم شعرا میں بھی شامل تھے انھوں نے جدید غزل کو لفظیاتی اور معنوی وسعتیں عطا کیں اور نئی فکر سے ہم آہنگ کیا۔ انھوں نے شاعری میں جو مقام ومرتبہ حاصل کیا اس میں ان کی زندگی کے شب وروز کی جدوجہد کو بہت زیادہ عمل دخل تھا۔ انھوں نے تکالیف اور مشقتوں سے بھری زندگی گزاری۔ ان کی شاعری میں ان تکلیفوں اور مشقتوں کا گہرا عکس ملتا ہے۔۔۔ یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ساٹھ کی دہائی میں غزل میں جو چند آوازیں اُبھر کر سامنے آئی تھیں مراتب اختر اُن میں نمایاں تر، منفرد اور یکسر اپنی پہچان رکھنے والی آواز ہیں جو بہت دیر تک زمانے کے سینے میں گونجتی رہی اور اب یہ ہماری ساعتوں سے ہمارے سینوں اور ہماری

رُوحوں کے راستے ہمارے ذہنوں میں شعور کے نئے پھول کھلانے کا کارن بن رہی ہے!!(۱۱)

سیّد مراتب اختر ایک صوفی اور درویش انسان تھے۔ ان کے اخلاق سے تمام ملنے والے متاثر ہوتے تھے۔ ان کے بارے میں ان کے بھتیجے سیّد متبسم محمود گیلانی ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

ان کی شخصیت میں جو گداز تھا، محبوبیت اور دِلنوازی تھی۔ جو وسیع القلبی تھی اور جو انسان دوستی تھی اس کی مثال نہیں ملتی۔ لہجہ اتنا شیریں کہ شہد کا گمان ہوتا۔ نرم اتنا کہ جیسے پھولوں کا لمس۔ وہ جتنے خوبصورت شعر کہتے تھے اس سے کہیں زیادہ اندر سے خوبصورت انسان تھے۔ وہ مسرتوں کا سرچشمہ تھے۔ محبتوں کا لنگر۔ ان کا وجود ہمارے خاندان کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ دلوں کو فتح کرنا جانتے تھے۔ وہ ہر مخاطب کے دِل میں قطرہ قطرہ اُترتے تھے اور روشنیوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر بن کر عیاں ہوتے تھے جو ایک بار ان سے مِلا وہ اُن کا ہو گیا۔ بڑی سادہ گفتگو کرتے تھے مگر اس میں بے کراں معانی پوشیدہ ہوتے جو لحہ لحہ عیاں ہوتے چلے جاتے تھے۔(۱۲)

پروفیسر ارجمند احمد قریشی اُردو ادب کے اُستاد ہیں اور ادبی حلقوں میں معروف نام ہیں۔ مراتب اختر کی شاعری کے حوالے سے وہ اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں:

ایم۔اے کرنے کے دوران میں ذوقِ جمال اور مذاقِ لطیف کی قدرے واضح صورت سامنے آئی۔ اَب قدماء کی شاعری بھی پڑھی اور جدید شعرا کا کلام بھی پڑھا۔ جوش کا طنطنہ، حفیظ کی روانی، اختر شیرانی کی منظر نگاری، فیض کی آتش بیانی، مجاز، ن۔م راشد، امجد کی جدت طرازی اور مصطفےٰ زیدی، فراز، احمد ندیم قاسمی کا حُسنِ بیان سبھی کچھ دیکھ ڈالا مگر ان کے علاوہ کسی اور شاعر نے تاثر کا جال مجھ پر نہ پھینکا، پھر ایک مرتبہ ادبِ لطیف میں سیّد مراتب اختر کی دس غزلیں دیکھیں، پڑھیں، دوبارہ پڑھیں اور یکبارگی گزشتہ تاثراتی جمود ٹوٹ گیا۔ یوں محسوس ہوا کہ میرے خیالات کے تالاب میں کسی نے انجانے میں چپ چاپ کوئی کنکر پھینکا ہو کہ میرا وجود خیال مرتعش ہو گیا کیونکہ مَیں

نے ان غزلوں کا لہجہ منفرد پایا اور ان کی لَے انوکھی محسوس کی۔ ان کی رنگت میں چاندنی کا نور بھی تھا اور صبحِ صادق کا اُجالا بھی۔ (۱۳)

سیّد علی ثانی گیلانی مراتب اختر کے بھتیجے ہیں۔ کئی کتابوں کے مؤلف ہیں اور ادارہ صوت ہادی چلا رہے ہیں۔ اسلامیات اور عربی کا گہرا مطالعہ ہے۔ اُردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ انھوں نے مراتب اختر کی یادوں کو ایک کتاب ''حسبِ مراتب'' کی صورت محفوظ کیا ہے۔ وہ مراتب اختر کی علم دوستی اور ذوقِ مطالعہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

ان کی اسلامیات کی کتب کا ایک علیحدہ باب ہے۔ سیرۃ النبی ﷺ، تفسیر، حدیث اور تاریخِ حدیث اور اسلامیات کے جنرل موضوعات پہ بے شمار کتابیں ہیں۔ ان کے ہاتھ کا لکھا سورۃ الدھر کا ترجمہ مجھے ملا۔ کسی موقع پر شائع کر دیا جائے گا۔ ان کو سورۃ مزمل شریف کے مضامین سے گہری دلچسپی تھی اور انھوں نے کئی بار اس کی تفسیر لکھنے کا عزم جتلایا۔ اللہ کریم نے توفیق دی تو ان کے اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کروں گا۔ چند کتب رُوسی ادب کی بھی ہیں ان میں چند ناول ''میکسم گورکی'' کے اور باقی آنتون چیخوف کے ہیں۔

حضرت اقبال کے بڑے متوالے تھے۔ ان سے گہری محبت و عقیدت بطور شاعر: اور کئی حوالوں سے ان کو یاد کرتے تھے؛ مفکرِ اسلام، عظیم راہنما، علامہ وقت، مردِ قلندر۔ اکثر ان کی کوئی نہ کوئی کتاب ان کے زیرِ مطالعہ رہتی اور ان کے اشعار کو بطور (Refrence) بھی استعمال کرتے تھے۔۔۔ اس کے علاوہ جناب واصف علی واصف کو بڑی محبت، لگاؤ اور انہماک سے پڑھتے تھے۔ ان کو آخری عمر میں ''کرن کرن سورج'' مطالعہ کرتے پایا۔ بلکہ دوسروں کو بھی پڑھنے کی دعوت دیتے اور کبھی ان کے اقوال دوسروں کو بھی سناتے۔ (۱۴)

حوالہ جات

۱۔ افتخار جالب، (مضمون)، آٹھ غزل گوشاعر، جاوید شاہین(مرتبہ)، شیخو شریف: مکتبہ میری لائبریری، لاہور

۲۔ محمد زکریا، ڈاکٹر، خواجہ، (مضمون)، مشمولہ: نقدِ مراتب (عون الحسن غازی)، شیخو شریف، ادارہ صوت ہادی، ۲۰۰۴ء، ص ۴۴

۳۔ مراتب اختر، جنگل سے پرے سورج، (باردوم)، شیخو شریف، ادارہ صوت ہادی، اوکاڑہ، ۲۰۰۷ء (فلیپ)

۴۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، سیّد مراتب اختر کی یاد میں، مشمولہ: نقدِ مراتب۔۔۔

۵۔ ظفر اقبال، ایضاً، ص ۴۸

۶۔ انور سدید، گنج گفتار (مضمون)، روزنامہ نوائے وقت، لاہور، سنڈے میگزین، ۲۳ ستمبر ۲۰۰۱ء

۷۔ صابر لودھی، سیّد مراتب اختر، (مضمون)، مشمولہ: نقدِ مراتب، ص ۸۷

۸۔ ناہید شاہد، ڈاکٹر، مشمولہ: نقدِ مراتب، ص ۷۳

۹۔ وحید اظہر، مراتب اختر اور ہم، مشمولہ: نقدِ مراتب، ص ۱۲۱

۱۰۔ زاہد حسن، (مضمون)، مشمولہ: نقدِ مراتب، ص ۱۲۴

۱۱۔ عون الحسن غازی، نقدِ مراتب، ص ۹، ۱۰، ۱۱۔۱۳۔۳۰

۱۲۔ متبسم محمود گیلانی، سیّد، چچا جان، ماہنامہ سجاد، ساہیوال/مانچسٹر، جنوری، ۱۹۹۳ء

۱۳۔ ارجمند احمد قریشی، پروفیسر، ایک زندہ شاعر، مشمولہ: ماہنامہ سجاد، ساہیوال/مانچسٹر، جنوری، ۱۹۹۳ء

۱۴۔ سید علی ثانی گیلانی، سیّد، حسب مراتب، شیخو شریف: ادارہ صوت ہادی، دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۲۳، ۲۴، ۲۵

باب نہم

ماحصل

ماحصل

بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں ہی عالمگیر تبدیلیوں کے زیر اثر اردو زبان و ادب میں شعری شعور ایک منفرد اور نئے رجحان میں داخل ہو چکا تھا۔ جس کے دھندلے خطوط ۶۰ کی دہائی میں واضح نقوش اختیار کر کے ایک عام آدمی کے لئے بھی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دینے لگے۔ زندگی میں تبدیلی کا راست اثر ادب پر بھی پڑتا ہے جو نمائندہ شخصیات کی تخلیقی جدوجہد کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ تبدیلی کا عمل بڑی شخصیات کے قلب میں جنم لیتا ہے جو اپنے الفاظ کی اثر آفرینی سے مروجہ سوچ پر غالب آجاتا ہے۔ بڑی شخصیات کو زمان و مکان کی حدود و قیود میں مقید کرنا محال ہو جاتا ہے۔ ایسی شخصیات کی تخلیقی جدوجہد کی پیمائش گھڑیوں، مہینوں اور سالوں کے معیارات سے ممکن نہیں ہوتی۔ ایسی ہی ایک قد آور اور پر اثر شخصیت مراتب اختر کے نام سے ساٹھ اور ستر کی دہائی میں اردو ادب کے شعری افق پر نمودار ہوئی اور اپنے جذبوں کی ہمہ رنگ قوس قزح کی روشنیاں بکھیر گئی۔ اس منفرد شاعر کی منفرد شاعری کا مقام و مرتبہ تو آئندہ تاریخی تناظر میں ہی ہوگا جس کو طے کرنا نقاد حضرات کا ہی کام ہے۔ لیکن اپنی تمام تر بے بصاعتی کے باوجود بڑے لوگوں کی آرا کو پیش کرنے کی سعادت اور ان کی شاعری کی عظمت کے تصویری خاکے اب بھی پیش کئے جا سکتے ہیں اور اس تصویر میں رنگ بھرنے کے لیے کسی بھی ناقد کو وسیع مطالعے کے ساتھ ساتھ طویل ذہنی سفر بھی کرنا پڑے گا تا کہ تصویر اپنے متعینہ چوکھٹے میں سج سکے۔ اس کی کچھ جھلک اور پرچھائیاں ان کے ہمسفر شعرا کی زبان ترجمان سے عیاں تو ہوتی ہیں مگر بشری محدودیتوں، باہمی عصبیتوں اور رقابتوں کی وجہ سے سچی اور پوری تصویر سامنے آنا ناممکن ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بڑے حقائق کو بین السطور ہی دیکھا جاتا ہے۔ لفظی گورکھ دھندے میں بڑی حقیقت کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ حقیقت اپنا لوہا خود منوا لیتی ہے۔ حفیظ جالندھری نے کیا خوب کہا تھا۔

اہلِ سخن کب مانتے تھے حفیظؔ
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

فطری اور پیدائشی صلاحیتیں، ذہنی اپج اور رویوں کا بہاؤ ماحول اور زمانے کے اندر ہی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔یعنی انسان کے اندر اثر پذیری اور اثر آفرینی کے تناسب سے ہی شخصیات کے کرداری رویوں کا معیار متعین ہوتا ہے۔ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے کسی خاص شعبہ زندگی میں منفرد شاکلہ کا حامل بنایا ہوتا ہے۔ اگر اُسے مناسب ماحول میسر آ جائے تو یہ فطری بیج تناور درخت بن کر بڑے دائروں کو اپنے چھتنار کے حصار میں لے لیتا ہے۔ اگر مراتب اختر کی زندگی کا اس تناظر میں جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مثالی صلاحیتوں کے حامل شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لئے مثالی میدانِ عمل فراہم کر دیا۔ سید مراتب اختر خاندان سادات میں سیّد محمد حسین گیلانی کے علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں انہیں اپنی فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں مدد ملی اور بچپن ہی سے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق ایک منفرد بچے کے طور پر پہچان لئے گئے۔ زمانہ طالب علمی میں ہی ان کے اندر کے حساس انسان نے باہر آنا شروع کر دیا اور جب وہ گورنمنٹ کالج سول لائنز لاہور میں پہنچے تو وہاں کے مخصوص ماحول کے زیر اثر ان کی سوچ، جذبوں اور صلاحیتوں کو نئے تجربات حاصل ہوئے۔ ان کی غزلوں کی کتابوں کے تجربی اثاثے ''حصار حال'' ''گنج گفتار'' ''جنگل سے پرے سورج'' اور نظموں کا مجموعہ ''گزرا بن برسے بادل'' ان کے شعری شعور کی بلندی کا رخ متعین کرتے ہیں۔ انہوں نے معاصر غزل اور نظم میں بے مثل خدمات سرانجام دیں اور بام شہرت پر پہنچے۔ مراتب اختر کی سیرت و کردار بچپن، لڑکپن اور جوانی میں بے داغ رہے۔ وہ انتہائی شریف النفس، کم گو مگر خوش گو، صاحب اخلاق اور اپنائیت و ملنساری کے اوصاف کے مالک تھے۔ نیکوکاری ان کا شیوہ حیات رہا۔ انہوں نے اپنے فکر و عمل میں اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق سے محبت کو اپنی فہرستِ ترجیحات کے پہلے نمبر پر رکھا۔ ان کے کردار کی ہر جنبش سے اس حقیقت کو دیکھا پایا گیا۔ ان

کی پوری شاعری پر یہ فکری سانچہ پوری طرح محیط ہے۔اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور توحید و وحدانیت ان کے وجود کی طرح ان کے کلام میں بھی سرائیت کئے ہوئے ہے۔ان کے کلام پر اگر سرسری سی نگاہ بھی ڈالی جائے تو توحید ربانی کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔''گنج گفتار'' کے آغاز میں ہی ان کا حمدیہ کلام ان کے تعلق معہ اللہ کو واضح کرتا ہے۔ایک سچے عاشق رسول کی طرح ان کے کلام میں عشق نبوی کا اظہار بھی جگہ جگہ موجود ہے۔''گنج گفتار'' کی نعتیہ غزلیں اسی حقیقت کی غماز ہیں۔ان کے پاکیزہ اشعار واضح کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک اظہار عشق نبوی محض لفظی جذبات کے اظہار کا نام نہیں بلکہ تکمیل ایمان کی ناگزیر شرط ہے۔اس نعتیہ کلام میں ان کی اپنی درویشانہ زندگی کی ایک جھلک بھی موجود ہے۔

مراتب اختر حضرت سیّد عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے اور صوفیانہ روش پر قائم تھے جو انہیں وراثت میں ملی۔ان کے کلام میں جابہ جا اظہار عجز، اظہار بندگی اور اظہار عقیدت پوری شان سے نظر آتے ہیں۔وہ دعا کو مومن کا طاقت ورترین ہتھیار سمجھتے ہیں، مایوسی کو کفر گردانتے ہیں اور ہر حالت میں کلمات شکر کے پرچار کرنے والے نظر آتے ہیں۔ان کی سیرت و کردار کے ساتھ ان کے کلام میں بھی تصوف اور اصطلاحات تصوف کے واضح نشان ملتے ہیں۔وہ قرب وسلوک کی منازل طے کیے ہوئے تھے جس کا سراغ ان کی زمانی وارضی حیات کے آخری سالوں سے مترشح ہوتا ہے۔ان کا اسلوب بیاں نئی تراکیب اور نئے الفاظ ومحاورات کے گرد گھومتا ہے۔کوئی بھی نقاد ان کی شاعری میں سے درگاہوں، مجاوروں، آئینوں، دھمال اور خانقاہی طرز حیات سے متعلق گوناں گوں الفاظ تلاش کر سکتا ہے۔ان کے نزدیک مستند خانقاہی نظامِ تربیت عین اسلامی اور مثالی کردار کی تخلیق کے لئے ناگزیر یونیورسٹیاں ہیں۔وہ عقیدت مندوں کے جذبوں اور خانقاہوں کے فی السبیل اللہ انتظامات سے پوری طرح باخبر اور اس کے قدردان نظر آتے ہیں۔وہ ایک حساس اور دردمند دل کے حامل فرد تھے۔انہوں نے زندگی اور زندہ لوگوں کے مسائل، مصائب، دکھوں اور پریشانیوں کو انتہائی قریب سے دیکھا۔

کرب اور دکھ کے ستائے ہوئے انسانوں کی چیخوں کو انہوں نے الفاظ کے روپ میں سمویا ہے۔ ان کے مشاہدات زندگی بہت وسیع ہیں جن میں گیرائی و گہرائی بھی پائی جاتی ہے اور تاثر پزیری بھی۔ زندگی کے مختلف شعبوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کے مختلف روپ بیان کر کے انہوں نے گویا کرداری مصوری کر دی۔ ان کا ذخیرہ الفاظ بہت وسیع ہے اور مناسب الفاظ، مناسب مقامات پر رکھنے کا فن انہیں خوب آتا تھا۔ انہیں مختلف زبانوں خصوصاً عربی، فارسی، ہندی، انگریزی اور پنجابی پر عبور حاصل تھا اور ان زبانوں کے الفاظ انہوں نے اپنے کلام میں استعمال کئے ہیں۔ مگر اظہار کمال کا نقطہ عروج یہ ہے کہ یہ الفاظ اجنبیت پیدا کرنے کی بجائے اظہار شدت اور وسعت پیدا کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات متنوع ہیں۔ ان کی شاعری میں کہیں کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا ذکر ہے تو کہیں ملوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے دستکاروں کا۔ کہیں غربت کی سچی اور بے رحم تصویر ہے تو کہیں امراء کے محلوں میں منعقد کئے جانے والے بے ہنگم جشنوں کا ذکر ہے۔ کہیں ہوٹلوں میں ہونے والی ضیافتوں کا تذکرہ ہے تو کہیں ہاتھوں میں کشکول لیے فقیروں کی بات کی گئی ہے۔

مراتب اختر نے زندگی کی کشمکش میں پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ بھی بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ وہ محبت کرنے والوں کو پیش آنے والی سماجی رکاوٹوں کا تذکرہ بھی پُر درد انداز میں کرتے ہیں اور رومان پرور موسموں کو بھی انہوں نے اپنے کلام میں خاص جگہ دی ہے۔ انہوں نے غزل کو خیالی اور فرضی کرداروں سے پاک کر کے گل و بلبل سے عملی زندگی کے مختلف میدانوں، کھیتوں، کھلیانوں، گلیوں، بازاروں اور دریاؤں تک پھیلا دیا۔ مراتب اختر کو سستی شہرت اور خود نمائی سے نفرت تھی۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں بھی یہ وصف موجود ہے۔ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ واردات قلبی کا بے ساختہ اظہار ہے۔ انہوں نے کبھی فرمائشی طور پر اخباروں، رسالوں اور مشاعروں کے لئے نہیں لکھا۔ وہ نہ صرف اسلوب اظہار سے واقف تھے بلکہ جرأت اظہار سے بھی آشنا تھے۔ انہوں نے آفاقی سچائیوں کے اظہار میں نہ تو جاگیرداروں کا خیال کیا اور نہ ہی وہ حکمرانوں سے خائف تھے۔

مراتب اختر حب الوطنی کے پاکیزہ جذبے سے بھی سرشار تھے۔ وہ کشمیر میں معصوم انسانوں پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم پر بھی رنجیدہ دکھائی دیتے ہیں اور پاک بھارت کی ۱۹۶۵ کی جنگ میں فوجی جوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف وہ بیت المقدس پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ کے خلاف مجاہدانہ آواز بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف انسانیت کے ناطے پر ہیروشیما اور ناگاساکی میں ہونے والی درندگی پر بھی مضطرب و بے چین نظر آتے ہیں۔ مراتب اختر ایک وسیع المطالعہ شخص تھے۔ ان کا مختلف زبانوں کی ادبیات پر اپنا ذاتی اور خصوصی موقف تھا جو کسی بھی حساس انسان کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ وہ ادب کا تہذیب اور ثقافت سے گہرا رشتہ خیال کرتے تھے اور اس کے زندہ انسانوں پر زندہ اثرات سمجھتے تھے۔ وہ زندگی کو ادب کا عکس گردانتے تھے اور کسی بھی قوم کی رگوں میں جدید احساسات کو ٹھوس طاقت سمجھتے تھے۔ خیال کی نیرنگی اور رعنائی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں امیجری کو بھی واضح مقام حاصل تھا۔ انہوں نے منظر نگاری میں وہ مقام حاصل کیا ہے جس کی مثال ملنا تقریباً محال ہے۔ ہر حساس شخص اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے رویوں سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ مراتب اختر بھی اپنی حساسیت کی وجہ سے دوسرے افراد کے سلوک اور رویوں کا جائزہ تو لیتے تھے مگر انہوں نے کبھی ردِعمل کی حکمتِ عملی پر عمل نہیں کیا۔ معاشرے کے کچھ افراد سے انہیں کچھ شکایات بھی تھیں مگر اس بات کا اظہار اتنے سلیقے سے کرتے ہیں کہ ناگوار خاطر نہیں ہوتا۔ ان کے کلام میں تکرارِ لفظی کے نادر نمونے موجود ہیں جن کی وجہ سے ان کے کلام میں عجیب موسیقیت پیدا ہوئی ہے۔ سچے انسانی جذبات کا اظہار صرف ایک سچا اور عظیم شخص ہی کر سکتا ہے۔ ان کے جذبات کی عکاسی کا انداز مختلف رنگوں، مختلف علامتوں اور مختلف زاویوں کے اعتبار سے ملتا ہے۔ ایک بڑے شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ انسان کے حواسِ خمسہ پر گہرے اثرات مرتب کرنے والے الفاظ کی کرشمہ سامانیاں کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں نیلے، پیلے، سرخ اور سبز رنگوں کے استعمال نے قاری کی آنکھوں کو مناظر بینی کی دعوت دی ہے جس کے لیے نگاہوں کی تربیت بہت ضروری ہے۔ سرسری نگاہ ان کے

سربستہ معانی سے محروم رہتی ہے۔ اس طرح بہت سے ایسے الفاظ جو صوتی اثرات پیدا کرتے ہیں انہوں نے استعمال کر کے اپنی قادرالکلامی کا واضح ثبوت دیا ہے۔

مراتب اختر ایک انسان دوست اور معاشرہ دوست فرد تھے۔ وہ دنیا میں امن کے خواہاں تھے اس لئے انہوں نے اپنی شاعری میں اپنی ذات اور اس کائنات کے ساتھ مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کر کے امن کو برقرار رکھنے کا عزم ظاہر کیا۔ وہ وطن عزیز کی ترقی اور امن کا خواب دیکھتے ہیں۔ وہ معاشرے میں جدید اثرات کی وجہ سے پائے جانے والی بدعنوانی اور ناہمواری، رشوت ستانی، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور تمام تر منفی انسانی سرگرمیوں کے شدید مخالف تھے۔ انہوں نے اپنے فکر و عمل سے بھرپور مزاحمت کا کردار ادا کیا ہے۔ وہ صرف معاشی و سماجی ناہمواریوں کا تذکرہ ہی نہیں کرتے بلکہ ایک پرامن اور اخلاقی خوبیوں سے مالا مال معاشرے کی تخلیق پر بھی ابھارتے ہیں۔ وہ ایک سچے، پکے اور پورے مسلمان تھے جنہوں نے اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں ٹھوس اقدامات کیے۔ وہ کوئی نظریہ باز اور نظریہ ساز شخصیت نہیں تھے بلکہ ان کی سوچوں کا اظہار پوری شدت کے ساتھ ان کے عمل سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مراتب اختر کا کلام اردو ادب کا سرمایہ ہے اور وہ اردو زبان کے محسن ہیں۔ وہ زندگی اور حقائق زندگی کے روائتی مفہوم کو کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے اور ان کا شخصی تجربہ جو معانی متعین کرتا تھا اُسے قبول کرتے تھے۔ آسمان کے بارے میں اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ شاید یہ سارا نیلا، طویل، گہرا، بے انت آسمان کچھ بھی نہیں صرف میرے خیال کا پھیلاؤ ہے اور پھر میرے خیال کی ساری اڑان بھی تو ایک لمحہ کی بات ہے۔ وہ اس کائنات کو ایک فلم کی طرح مسلسل سمجھتے تھے جس کا ناظر ایک منظر کو دیکھ کر اُٹھ جائے اور اس نے پوری فلم کو اسی ایک منظر سے سمجھنا ہو۔ جو صرف ایک ذی الحس انسان کا ہی حصہ ہوتا ہے اور اس کی زندگی کے تمام تر فیصلوں کا انحصار اسی ایک منظر پر ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں یہ دقیق النظری واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ان کے کلام میں استعمال کیے گئے سارے الفاظ اور الفاظ کے سارے حروف اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف ایک سوچنے سمجھنے والی شخصیت تھے بلکہ

ایک ٹھوس اور پائیدار کردار کے حامل شاعر تھے۔

ایک شاعر کا کمال اس کی تخلیقی جدوجہد میں نئی تراکیب سازی کے فن میں مضمر ہوتا ہے۔ مراتب اختر اپنے عصری شعرا کی طرح نئی تشکیلات کی تخلیق سے بھی متاثر ہوئے اور ان کی شاعری میں نئی تراکیب قاری کو تخیل کی نئی دنیا میں پہنچا دیتی ہیں۔

مراتب اختر کا دینی شعور بہت پختہ نظر آتا ہے۔ اسلام کی ازلی ابدی سچائیاں ان کے رگ و ریشے میں سموئی ہوئی ہیں۔ قرآن پاک اور تلاوت قرآن پاک سے انہیں خصوصی شغف رہا۔ قرآن پاک کی مخصوص سورتوں کا منظوم ترجمہ ان کے اخلاص اور قرآن سے ان کے گہرے لگاؤ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ منظوم تراجم موقف ربانی کا سچا اور پورا اظہار ہیں اور مراتب اختر کی قلبی سطح کے آئینہ دار ہیں۔

مراتب اختر کی شخصیت کے کئی روپ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ منقسم شخصیت نہیں ہیں۔ ان کے ہر روپ میں دوسرے سارے روپ پوری طرح جذب ہیں۔ وہ قادرالکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سچے پاکستانی، پکے مسلمان، انسان دوست، امن کے پیامبر، منفرد فنکار، صوفی منش ہستی اور مخلص دوست تھے۔ ان کی شخصیت کے یہ سارے پہلو ایک ہی منشور کے مختلف رنگ ہیں جو علیحدہ ہو کر بھی غیر منقسم رہتے ہیں۔ ان کی زندگی میں کامل ہم آہنگی اور اعلیٰ درجے کا توازن ہے۔ گو ان کی زمانی و مکانی حیات کا عرصہ بہت کم ہے مگر ان کی معنوی حیات واضح طور پر ارضی و مادی حدود و قیود کو پھلانگتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور یہ بڑی آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر ان کی زندگی وفا کرتی اور وہ اپنے تجربات زندگی کو پورے طور پر بیان کر پاتے تو ان کی تصنیفات کی تعداد درجنوں میں ضرور ہوتی اور قاری ان کے دردمند دل کی دھڑکن کو ذرا قریب سے سن پاتا۔ ان کے معاصر شعرا نے ان کی زندگی میں ہی ان پر طاری ہونے والی قلبی واردات کو بھانپ لیا تھا۔ وہ ایک کائناتی تجربے کا دائرہ مکمل کرنے نکلے تھے جسے وہ زندگی کی وفا نہ کرنے کی وجہ سے نامکمل چھوڑ گئے۔ ان کی رفتار اظہار عین وہی تھی جو کسی عظیم شاعر کی روش ہوتی ہے۔ اس صاحب دل شاعر کی شاعری میں گہرا تفکر، فہم عصر اور صوفیانہ طرز فکر پوری شان سے پائے

جاتے ہیں۔ان کی آزاد نظموں پر بسا اوقات ن،م راشد،فیض اور مجید امجد کے کلام کا گمان ہوتا ہے۔ان کے آفاقی کلام کا کمال یہ ہے کہ حالات و واقعات اور زمانے کی شکست و ریخت کے تھپیڑے اُس کو متاثر کرنے سے قاصر ہیں۔اس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مراتب اختر ہر دور کا زندہ اور موجود شاعر ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کی حدود میں گرفتار نہیں کئے جا سکتے۔ یہ زندگی لطیف احساسات کے تضادات کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے ایک معمہ ہے جسے سمجھنے کے لئے انکشاف حقائق کی ضرورت ہے۔اگر کچھ بنیادی حقائق کا سراغ انسان کی بصیرت و بصارت پر واضح ہو جائے تو اس الجھن کی سلجھن ممکن ہو جاتی ہے۔اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ان کے کلام میں ان کے اندرون کی گہرایوں کے بے پناہ امکانات نظر آتے ہیں۔ انہیں صلاحیتوں کی وجہ سے انہوں نے اندھیرے سے اجالے تک کا سفر کامیابی سے طے کیا ہے۔انہیں قطرے میں طوفانی سمندر اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا سورج ایک مبہم سا نقطہ دکھائی دیتا ہے۔چونکہ یہ دنیا دھوکہ اور فریب کی دنیا ہے۔اس میں زہر، شہد اور آب، سراب لگتا ہے، عکس شخص لگتا ہے اور شخص عکس لگتا ہے ۔اس فریب سے باہر آنے کا نام انسانی جدوجہد یا انکشاف حقائق ہے جسے پانے میں وہ کامیاب رہے۔

اگر ہم مراتب اختر کی زندگی کا ان کے الفاظ، کلام، اعمال اور طرز زیست کے حوالے سے مجموعی لب و لہجے کا خلاصہ پیش کرنا چاہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک با مقصد شخصیت تھے جنہوں نے خدا، انسان اور کائنات کی مثلث کے باہمی رشتوں کی پاسداری کرتے ہوئے اپنی زندگی بسر کی۔ بلا شبہ وہ ایک عظیم انسان اور بہترین شاعر تھے۔ میں اپنے ممدوح ''مراتب اختر'' کو اس طرح یاد کرتا ہوں جیسے کوئی دیارِ غیر میں بستے ہوئے کسی عزیز کو یاد کرتا ہے، جیسے کوئی مرحوم تختِ شہنشاہ اپنے جاہ و جلال کو یاد کرتا ہے، جیسے کوئی اسیر آزادی و سکون کو یاد کرتا ہے، جیسے کوئی بھٹکا ہوا پنچھی اپنے مسکن کو یاد کرتا ہے۔

کتابیات

☆ اختر حسن، گیانگر میں لنکا، لاہور: تخلیقات پبلشرز، س۔ن

☆ اصغر علی گیلانی لاہوری، سیّد، شجرۃ انوار، (قلمی نسخہ)، شیخوشریف: گیلانی لائبریری

☆ افضال حسین گیلانی، سیّد، سوانح حیات حسنین سائیں، ادارہ صوتِ ہادی، اوکاڑہ

☆ افضال حسین گیلانی، سیّد، حیات الامیر (جلد اوّل)، شیخوشریف: ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۶ء،

☆ افضال حسین گیلانی، سیّد، حیات الامیر (جلد دوّم)، دارصوتِ ہادی، اوکاڑہ

☆ افضال حسین گیلانی، سیّد، حیات سیّد سید محمد گیلانی، شیخوشریف: ادارہ صوتِ ہادی

☆ افضال حسین گیلانی، سیّد، کافی اے یار داویہڑا، شیخوشریف: ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۹ء

☆ الطاف حسین حالؔی، کلیاتِ نظم حالی، حصہ اول

☆ اللہ دتہ نسیم سلیمی، میاں، تاریخ دیپالپور، لاہور: سنی پبلشرز، ۱۹۹۳ء

☆ انور شعور، مشقِ سخن، کراچی: ڈائیلاگ پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء

☆ انیس ناگی، پاکستانی اُردو ادب کی تاریخ، لاہور: جمالیات، ۲۰۰۴ء

☆ جاوید شاہین، (مرتب) آٹھ غزل گو، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۶۸ء

☆ جون ایلیا، شاید، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء

☆ جیلانی کامرانی، نئی نظم کے تقاضے، لاہور: کتابیات، اشاعت دوم، ۱۹۶۷ء

☆ سلیم احمد، نئی شاعری نامعقول شاعری، کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۹ء

☆ سید علی گیلانی، سیّد، حسبِ مراتب، شیخوشریف: ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۶ء

☆ سید علی ثانی گیلانی، سیّد، شجرۃ اشراف، ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۳ء

☆ سیّد سجاد، نئی نظمیں، لاہور: نئی مطبوعات، ۱۹۶۷ء

☆ طارق ہاشمی، ڈاکٹر، اُردو غزل ـــــ نئی تشکیل، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۸ء

☆ عون الحسن غازی، سیاہ آسمان میں، شیخوشریف: ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۷ء

☆ عون الحسن غازی، نقدِ مراتب، شیخوشریف: ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۴ء

☆ مخدوم منور، نثری نظم کی تحریک، ملتان: کاروانِ ادب، اشاعت دوم، ۱۹۸۲ء
☆ مراتب اختر، گنج گفتار، شیخوشریف: ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۱ء
☆ مراتب اختر، جنگل سے پرے سورج (باردوم)، شیخوشریف: ادارہ صوتِ ہادی، ۲۰۰۷ء
☆ مراتب اختر، گزرا بن برسے بادل، ادارہ صوت ہادی، دسمبر ۲۰۰۴ء
☆ مشتاق عادل، تاریخِ ساہیوال، ساہیوال: مہکاں پبلشرز، ۲۰۰۹ء
☆ وزیر آغا، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا مزاج،

رسائل وجرائد

☆ آئینہ کرم (ماہنامہ)، جھنگ، شمارہ ۳۳، جون ۲۰۱۲ء
☆ ادبِ لطیف (ماہ نامہ)، لاہور، مارچ ۱۹۶۸ء
☆ ادبیات، (سہ ماہی)، شمارہ ۳۶، اسلام آباد
☆ سہ ماہی صوت ہادی (ناصر شہزاد نمبر، جنوری تا مارچ)، ۲۰۰۹ء
☆ سجاد (ماہنامہ)، ساہیوال رمانچسٹر، جنوری ۱۹۹۳ء
☆ ہمایوں (ماہنامہ)، لاہور، جولائی ۱۹۵۳ء

اخبارات

☆ نوائے وقت (روزنامہ)، لاہور، سنڈے میگزین، ۲۳ ستمبر ۲۰۰۱ء

مقالہ جات

☆ اصغر علی بلوچ، ڈاکٹر، فلسفہ اخلاق اور بیسوی صدی کی اُردو نظم (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی) لاہور: مخزونہ لائبریری اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۹ء

پیکر سے خاک جھاڑ کے دوڑوں گا تیری سمت
گھنٹی جونہی بجے گی ابد کے سکول کی